7359

میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ

(مطالعات)

ڈاکٹر اے بی اشرف

بیکن بکس گلگشت ملتان

Scanned by CamScanner

Ikram Ul Haq Bhatti

LIBRARY
No. 7359
Date

دارالشعور
37- مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور
042-7239138
042-8460196

Scanned by CamScanner

”میر، غالب اور اقبال“

(مطالعات)

ڈاکٹر اے بی اشرف

بیکن بکس گلگشت ملتان

Scanned by CamScanner

LIBRARY
735-9

انتساب

اساتذہ گرامی

علامہ عبدالرشید نسیم طالوت، مرحوم

ڈاکٹر سید عبداللہ، مرحوم

سید وقار عظیم، مرحوم

علامہ عتیق فکری، مرحوم

ڈاکٹر مہر عبدالحق، مرحوم

اور

اپنے ہم جماعت اور پیارے دوست

ڈاکٹر ملک حسن اختر مرحوم

کے نام

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں

اب دیکھنے کے جن کو آنکھیں ترستیاں ہیں

Scanned by CamScanner

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	تعارف	۷
۲	میر اور غالب کا تقابلی مطالعہ	۱۷
۳	میں --- معترف میر	۴۶
۴	غالب اور اقبال کا تقابلی مطالعہ	۵۴
۵	غالب کا فن	۸۴
۶	کلام غالب میں تمثال شعری کی بہترین مثال	۹۹
۷	غالب --- عصر حاضر کے آئینے میں	۱۰۴
۸	فلسفہ اقبال اور اس کے ماخذ	۱۱۴
۹	اقبال کا شعور انقلاب	۱۵۲
۱۰	اقبال کا نظریہ خیر و شر	۱۵۹
۱۱	اقبال کا نظریہ تعلیم	۱۶۶
۱۲	تنقید اقبال کی ایک نئی جھلک	۱۷۳
۱۳	اقبال اور ترکمان سخت کوش	۱۸۰
۱۴	مسجد قرطبہ --- اقبال کی شاہکار نظم	۱۹۰
۱۵	روڈ ولف پان وچ اور اقبال	۲۰۰

Scanned by CamScanner

تعارف

۱۹۸۸ء میں بیکن بکس ملتان سے میری دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک "غالب اور اقبال" اور دوسری "میر غالب اور اقبال' تقابلی مطالعہ" ---- اس دفعہ ملتان گیا تو جبار صاحب نے کہا کہ دونوں کتابوں کے مضامین یکجا کر کے ایک کتاب بنا دوں۔ بات بالکل درست تھی اس لئے ان کے مشورے کے مطابق اب دونوں کو یکجا کر کے ایک کتاب کی صورت دے دی ہے۔ دو ایک مضامین مزید شامل کر دیئے ہیں اور کچھ ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے۔

زیر نظر کتاب میر' غالب اور اقبال پر لکھے گئے میرے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں یہی تین سب سے بڑے نام ہیں۔ میر اٹھارہویں' غالب انیسویں اور اقبال بیسویں صدی کے شاعر ہیں۔ تینوں کے زمانے الگ ہیں اور تینوں کے شعری رویے اور تخلیقی اہداف بھی مختلف ہیں۔ میں نے تینوں کی شاعری کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر الگ سے مضامین بھی لکھے ہیں۔ پہلے مضمون میں میر اور غالب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ میر کی شاعری جذبوں میں طوفان پیدا کرتی ہے اور غالب کی شاعری جذبے اور فکر دونوں کو متحرک کرتی ہے۔ کلام میر جذبات و احساسات کی تطہیر کرتا ہے تو غالب کا کلام مسرت و بصیرت کے مشترک احساسات کو ہوا دیتا ہے میر کی شاعری بہکی بہکی باتوں' واردات قلبی اور وجدانیت کی حامل ہے۔ غالب کی شاعری سوچی سمجھی' فکر انگیز باتوں اسلوب کی جدت اور ندرت خیال کی حامل ہے۔ بعض ماہرین فن نے دونوں کو یکساں رویوں کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ جناب ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے مضامین (نقد میر میں) ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ بعض عناصر کے لحاظ سے دونوں میں یکسانیت کا رنگ دکھائی دے جاتا ہے۔ تاہم میں نے اپنے اس مضمون میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ میر اور غالب مختلف رویوں کے شاعر ہیں اور دونوں کا نقطہ

Scanned by CamScanner

نظر زندگی اور فن کے بارے میں بالکل مختلف ہے۔

میں نے دونوں کے دیوان سامنے رکھ کر اپنے موقف کی تائید محض ان کے اشعار کے حوالے سے حاصل کی ہے۔ یہ درست ہے کہ دونوں کے یہاں ان اشعار کے بالکل برعکس اور متضاد مفہوم کے حامل اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ مستثنیات میں شمار ہوں گے۔ کیونکہ کسی بھی شاعر کا رویہ بحیثیت مجموعی یا اکثریتی کلام کے حوالے سے متعین کرنا چاہیے اور میں نے اس مضمون میں یہی کیا ہے۔ مثلاً" میر ایک غم زدہ شاعر اور قنوطی فلسفے کے مبلغ ہیں۔ ان کے دیوان کا بیشتر حصہ اسی قسم کے اشعار پر مشتمل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں زندگی سے لگاؤ یا امید اور حوصلے کے جذبوں کو انگیخت کرنے والے اشعار بالکل مفقود ہیں یا چونکہ غالب کا غالب رجحان امید' امکان اور بھرپور زندگی سے عبارت ہے' اس لئے ان کے یہاں ناامیدی' مایوسی اور دکھ کے مضامین موجود ہی نہیں' نہیں' ایسا نہیں ہے کیونکہ کوئی شاعر کسی ایک وقت میں کسی مخصوص جذبے کے تحت کسی ایک رویے کا اظہار کرتا ہے تو دوسرے وقت میں کسی اور جذبے کے تحت دوسرے رویے کا۔ اس لئے کسی بھی شاعر کے نقطہ نظر کو مجموعی تاثر کے حوالے ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ میں نے میر اور غالب کے مجموعہ ہائے کلام سے بحیثیت مجموعی تاثر حاصل کیا ہے اور اپنے موقف کو اشعار کی بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ اسی لئے میرے اس مضمون میں اشعار کی بھرمار نظر آئے گی۔ بلکہ میں نے اپنے اسلوب اور تنقیدی جملوں کو بھی انہی اشعار کی نثر بنا کر مزین کیا ہے تاکہ میری ہر بات میں خود کلام شاعر کے حوالے سے جواز دکھائی دے اور ہر جملہ اپنی دلیل آپ بن جائے۔

اس کتاب کا دوسرا مضمون " میں --- معترف میر" ایک تاثراتی مضمون ہے۔ یہ مضمون لکھنے کا سارا کریڈٹ میرے محترم و مکرم استاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کا ہے۔ میر پڑھاتے وقت جو سحر وہ ہم سب پر کر دیتے تھے اس کا اثر آج بھی

Scanned by CamScanner

زائل نہیں ہوا۔ یہ مضمون اسی اثر کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کا تیسرا مضمون غالب اور اقبال کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ کچھ اہل فن نے میر اور غالب کی طرح غالب اور اقبال میں بھی مشترک رویے تلاش کئے اور دونوں کو ایک ہی مکتب فکر کے پیروکار قرار دیا (اس مضمون میں حوالے موجود ہیں) لیکن میرا موقف ان دو عظیم شعراء کے بارے میں بھی یہی ہے کہ دونوں مختلف رویوں اور مختلف نقطہ ہائے نظر کے شاعر ہیں۔ ان میں کسی قسم کا اشتراک محض اتفاق ہے ورنہ دونوں شاعر ہر لحاظ سے مختلف اور متضاد رویوں کے شاعر ہیں۔ اپنا یہ مضمون مکمل کرنے کے بعد میں نے اردو اکادمی ملتان کے ایک تنقیدی اجلاس میں پیش کیا تھا۔ میرے بعض دوستوں نے اس مضمون سے یہ تاثر لیا کہ میں نے اس موازنے میں اقبال کو غالب پر فوقیت دی ہے اور انہیں بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ تاثر کسی حد تک غلط بھی نہیں ہے کیونکہ ایک مکتب فکر کے مطابق ادب مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ وسیلہ ہے انسانی فکر کی توسیع کا اور ذریعہ ہے کسی بڑے مقصد کے حصول کا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اقبال کی شاعری غالب کی شاعری پر یقیناً" فوقیت حاصل کر جاتی ہے کیونکہ اقبال بلاشبہ ایک بہت بڑے مقصد اور آدرش کے مبلغ تھے۔ انہوں نے ادب و شعر کو انسان کی فلاح' معاشرے کی تزئین اور ملت کی بیداری جیسے عظیم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را
اقبال

اقبال نے بالخصوص جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی سعی کی اور اپنی شاعری کو پیغام کا وسیلہ بنایا۔ ان کا یہ مقصد بہت عظیم تھا۔ وہ شاعری کو محض جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ تصور نہیں کرتے تھے بلکہ دلوں کو ولولۂ تازہ

Scanned by CamScanner

دینے' آدم کو نیابت الہٰی کا درجہ دلانے اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کے خواب کو تعبیر آشنا کرنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ جبکہ غالب کے سامنے اس قسم کا کوئی عظیم مشن نہیں تھا۔ انہوں نے ادب کو ادب کی خاطر برتا۔ اپنے جذبات و احساسات کو زبان دینے کا وسیلہ جانا اور بس ----- اقبال ایک مذہبی مفکر' ایک بامقصد فلسفی' ایک معلم اخلاق' ایک قومی رہنما' ایک واضح آدرش کے حامل مصلح' ایک سیاست دان اور ایک حریت پسند شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جبکہ غالب محض شاعر تھے ------- نہ مصلح' نہ سیاست دان' نہ قومی رہنما' نہ کسی مربوط نظام فکر کے داعی' نہ معلم اخلاق ----- چنانچہ ظاہر ہے ادب میں مقصدیت کے قائل لوگوں کے نزدیک اقبال کو غالب پر فوقیت دینا بے جا نہیں۔ اپنے اس مضمون میں میرے مطالعے کا مرکزی نقطہ یہی ثابت کرنا تھا کہ دونوں شاعروں کا شعری تناظر' تخلیقی ہدف' موضوعات و مضامین اور نقطہ ہائے نظر مختلف اور متبائن تھے۔ اپنے آدرش اور ہدف مقاصد کے اعتبار سے اقبال غالب سے آگے تھے ----- بلاشبہ' لیکن یہاں مجھے اپنے اس موقف کا برملا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ خالصتاً" ادب کے نقطہ نظر سے میں غالب شاعر کو اقبال شاعر پر ترجیح دیتا ہوں اور اس کے اسباب یہ ہیں:-

(۱) غالب وسیع تر انسانی جذبوں' رابطوں اور رشتوں کے شاعر ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری کا افق وسیع ہو جاتا ہے جبکہ اقبال نے اپنے آپ کو ایک مخصوص مقصد تک محدود رکھا۔

(۲) غالب نے زندگی کی وسعت' تنوع اور انتشار کو اپنے اشعار میں سمو کر انسانی محسوسات کو متحرک کیا جبکہ اقبال ایک ہی آدرش کے گرد گھومتے رہے۔ ان کا مرکزی موضوع خودی کا اثبات ہے جو عام انسانی محسوسات سے ماورا ہے۔

(۳) غالب کا نقطہ نظر وسیع انسانی برادری کا احاطہ کرتا ہے جبکہ اقبال عموماً" ایک مخصوص ملت تک محدود رہے۔

(۴) غالب بنیادی انسانی جذبوں کو شعری تجربوں کا مواد بناتے رہے جبکہ اقبال انسانی عزائم کے استحکام' بلند نگہی' اور فلسفہ و فکر سے مملو خیالات کو اشعار میں ڈھالتے رہے۔

(۵) غالب نہ تو معلم اخلاق بنے نہ ناصح شفیق' ان کے یہاں خطیبانہ انداز نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ اقبال ایک مخصوص اخلاق کے مبلغ' ایک معلم' ایک ناصح اور ایک خطیب کی حیثیت اختیار کر گئے۔

(۶) غالب کا ڈکشن زیادہ وسیع اور ان کے شعری اور تخلیقی تجربے زیادہ فطری اور دلکش ہیں۔ اقبال کا ڈکشن مخصوص اور شعری تجربات واضح مقصد کے تحت وجود میں آئے۔

دراصل اقبال ایک مخصوص قوم اور ملت کے شاعر بن کر رہ گئے۔ ان کا آدرش اس قدر عظیم اور مرعوب کن تھا کہ عام انسانی محسوسات اس سے متحرک نہ ہو سکتے تھے۔ وہ بحیثیت مجموعی ایک قوم کو تو متحرک کر سکتے تھے لیکن عام انسانی جذبوں کو ان کا فلسفہ اپیل نہیں کرتا۔ ان کا فلسفہ ماورائیت اور مابعد الطبیعاتی مسائل اور مراحل سے پر ہونے کی بناء پر بوجھل ہو کر رہ گیا۔ خودی کے مفہوم' اس کے مراحل' منازل' تربیت' بے خودی سے اس کا تعلق' عشق کے مثالی اور ماورائی تصورات ------ یہ سارے موضوعات اور ان کا مابعد الطبیعاتی رنگ خالص شعری وژن کے نہیں فلسفیانہ ذہن و فکر کی پیداوار نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:-

"حق یہ ہے کہ پیکار حیات کے مادی متعلقات کی حد تک اقبال کا نظام فکر بڑا جاذب توجہ ثابت ہوتا ہے مگر تسخیر کائنات کی منزل کے بعد اقبال بھی اس پر اسرار ماورائیت کا سہارا ڈھونڈتے ہیں' جو حیرت سے پیدا ہوتی ہے' ارتقائے حیات کو تسلیم کر لینے کے باوجود اگر زندگی کا انجام سکون (یعنی کسی ذات میں فنا یا کسی ذات کا ہمارے جوہر میں جذب ہو جانا) ہے تو اس کے لئے نہایت زمانی کو تسلیم کرنا پڑے گا

جس کی تائید اقبال کے فلسفے میں نہیں ہوتی" (اقبال کے فکری آئینے مرتبہ حسن رضوی ص ۹۷-۹۸)

بلاشبہ اقبال نے فلسفیانہ موضوعات کو خوبصورت شعری پیکروں میں ڈھالا لیکن وہ بنیادی انسانی جذبوں سے زیادہ بلند عزائم اور ارفع مقاصد کے ترجمان بنے رہے۔ جبکہ غالب نے بنیادی انسانی جذبوں کو متاثر کیا۔ ان کے موضوعات ان تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں جن کو غالب نے زندگی کے تکون سے اخذ کیا۔ بدلتی ہوئی سماجی اقدار' ان کی کش مکش ------ غالب کے شعری وژن کا مواد بنی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا موقف بھی کم و بیش وہی ہے جو اس سلسلے میں میرا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"..... غالب و اقبال میں سے اگرچہ دونوں کا مزاج فلسفیانہ تھا لیکن غالب صرف شاعر بن کر نکلے اور اقبال شاعر و فلسفی دونوں غالب شاعری میں فلسفہ کی صرف ایک صفت یعنی موضوع کی کلیت و ہمہ گیری کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کے یہاں انسان کے عام فطری تقاضوں' خواہشوں' ولولوں' مایوسیوں اور تجربوں کی عکاسی ہے' زندگی کے مختلف حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح ہے' انسانی محسوسات کے نفسیاتی تجزیے ہیں' اس کے برعکس اقبال کے یہاں ایک متعین و مخصوص فلسفہ حیات ملتا ہے جو عقلی اور لچک دار ہونے کے باوجود بڑی حد تک نظری اور جامد ہے۔ اقبال اقتضائے بشری اور انسانی نفسیات کو اکثر نظرانداز کر جاتے ہیں اور ایسا یزداں شکار و کمند آور رجائیت کا سبق دیتے ہیں جو زندگی کے عملی میدان میں اس قدر کارآمد نہیں جس قدر کہ وہ نظری طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں اکثر فلسفہ' فن پر غالب آ جاتا ہے لیکن غالب کے یہاں فلسفہ ہمیشہ فن سے مغلوب رہتا ہے" (غالب شاعر امروز فردا ص ۱۲۴-۱۲۵)

یہاں میں ایک بار پھر تقابلی مطالعہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے موقف کو غالب اور اقبال کے شعری کمالات کے الگ الگ جائزے سے پیش کرنا چاہتا ہوں' تاکہ

Scanned by CamScanner

دونوں شاعروں کے بنیادی نظریات اور فنی عظمتوں کا ایک واضح عکس سامنے آ جائے اور اس کے بعد دونوں کے بارے میں آپ خود ایک فیصلے تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ غالب کے فن کے مطالعے کے لئے میں نے تین عنوان قائم کئے ہیں۔

(۱) غالب کا فن ---- سیاسی اور سماجی تناظر میں'

(۲) کلام غالب میں تمثال شعری کی بہترین مثال

(۳) غالب عصر حاضر کے آئینے میں

پہلے عنوان کے تحت غالب کے فن کا ان کے ذاتی حالات اور سیاسی و سماجی تناظر میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی مضمون میں ان کے کلام کے علاوہ مکتوبات سے بھی حوالے درج کئے گئے ہیں تاکہ بات کو مدلل بنایا جا سکے۔ دوسرے عنوان کے تحت غالب کی ایک غزل کے قطعہ بند کو سامنے رکھ کر ان کی تمثال آفرینی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تہذیبی سطح پر زوال کی جو تصویر غالب نے اس غزل کے حوالے سے کھینچی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ غزل غالب کے شعری جنس کا اعلی نمونہ ہے۔ اسی طرح تیسرے عنوان کے تحت غالب کو عصر حاضر کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ وہ کون سے عناصر ہیں جو عصر حاضر میں بھی غالب کی مقبولیت اور فنی عظمت کو نہ صرف برقرار رکھتے ہیں بلکہ زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں ---- اس مضمون میں مجملاً ان کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔

جہاں تک اقبال کا تعلق ہے سب سے پہلے ان کے فلسفے کے پس منظر' مفہوم' مراحل اور ماخذ کی بحث ہے بالکل اسی طرح جیسے غالب پر لکھے گئے پہلے عنوان کے تحت ان کی شاعری کے سیاسی و سماجی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد چند ایک عنوانات کے تحت اقبال کے فلسفے کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس طرح غالب کی ایک مخصوص غزل کے حوالے سے ان کی فنی عظمت کا جائزہ لیا گیا ہے اسی طرح اقبال کی ایک مخصوص نظم (مسجد قرطبہ) کے حوالے سے اقبال کی فنی عظمت کا نقش ابھارا گیا ہے۔ پھر کچھ عنوانات کے تحت افکار اقبال کے

Scanned by CamScanner

مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ البتہ ایک مضمون ایسا بھی ہے جو ڈاکٹر این میری شمل کے لکھے ہوئے ایک مضمون (بزبان انگریزی) سے ماخوذ ہے۔ میں نے اقبال شناسوں کی دلچسپی کے لئے یہ مضمون اس لئے شامل کر دیا ہے کہ اس سے پہلے اس موضوع اور عنوان پر میری نظر سے کوئی مضمون نہیں گزرا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اقبالیات کے سلسلے میں ایک بالکل منفرد مضمون ہے اور اقبالیات کے ذخیرے میں اضافہ ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر میں نے یہ مضمون بھی اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔

اپنے پیارے دوستوں اور عزیزوں میں احمد خان درانی، ارشد ملتانی، پروفیسر عرش صدیقی، پروفیسر اصغر علی شاہ، مرزا ابن حنیف، پروفیسر مبارک احمد مجوکہ، فیاض تحسین، ڈاکٹر انوار احمد، پروفیسر فاروق عثمان، ڈاکٹر محمد امین، ڈاکٹر عقیم حیدر ترمذی، ڈاکٹر عبدالروف کوثر، ڈاکٹر صلاح الدین حیدر، پروفیسر خالد سعید، ڈاکٹر نجیب جمال ڈاکٹر اسلم ادیب، ملدار حسین بخاری اور ڈاکٹر روبینہ ترین کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اردو اکادمی کے اجلاسوں میں ان مضامین پر تنقیدی آراء کا اظہار کر کے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

محبان عزیز محمد افسر ساجد، ڈاکٹر طاہر تونسوی، نعیم چوہدری، جاوید اختر بھٹی اور اصغر ندیم سید کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ دل بڑھاتے اور ادبی سرگرمیوں میں فعال رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

فیض صاحب اور جبار صاحب کتابیں چھاپ کر عملی طور پر محبت اور تعاون کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے بزرگ دوستوں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور پروفیسر خلیل صدیقی کی شخصیتیں مجھے تحرک عطا کرتی ہیں اور یہی تحرک میں محمد نعیم خان تک منتقل کرنا چاہتا ہوں جو میرا بیٹا بھی ہے اور دوست بھی۔

ترکی میں میرا زیادہ تر وقت اپنے محترم استاد اور بزرگ دوست ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور ڈاکٹر شوکت بولو کی علمی صحبتوں میں اور اپنے بھائی احمد نواز،

Scanned by CamScanner

رائے شکیل اختر، اکرام اللہ، کامران محی الدین، ڈاکٹر انوار اللہ قریشی، ڈاکٹر قمر الاسلام، ڈاکٹر افتخار احمد، سہیل محمود، اورنگ زیب خان، ڈاکٹر فخر محمود ڈاکٹر نذیر فرید ڈاکٹر سلمی بنیلی، ڈاکٹر گلسرین ہالی جی، آسمان بیلن اور جلال سوئیدان کی مجلسی محفلوں میں گزرا ---- یہ محفلیں ناقابل فراموش ہیں۔

احمد بختیار اشرف

شعبہ اردو زبان و ادبیات
انقرہ یونیورسٹی
۲۶ فروری ۱۹۹۴ء

Scanned by CamScanner

میر اور غالب کا تقابلی مطالعہ

(۱)

اپنے رنگ کلام کے اعتبار سے اردو کے دو شاعر ایسے ہیں جن کی انفرادیت اور عظمت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ ان میں ایک تو میر ہیں اور دوسرے غالب۔ دونوں میں زمانی بعد بھی ہے اور ذہنی و فکری بعد بھی۔ میر کا زمانہ اٹھارہویں صدی (۱۷۲۳۔۱۸۱۰ء) کا ہے تو غالب کا انیسویں صدی (۱۷۹۷۔۱۸۶۹ء) کا۔ میر کو اردو غزل کی کمزور روایت ورثے میں ملی تو غالب کو توانا۔ میر کا زمانہ انگریز سامراج کے اقتدار کے آغاز کا دور ہے تو غالب کا زمانہ دور عروج۔ پھر دونوں کی افتاد طبع مختلف اور متبائن ہے اور اسی وجہ سے دونوں کے فنی و فکری رویے بھی مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ ایک نے شدید جذبوں کو وفور جذبات کے ساتھ پیش کیا تو دوسرے نے اپنے تاثرات کو تعقل میں ڈبو کر جذبہ و فکر کو ہم آہنگ کر دیا۔ ایک کی باتیں بہکی بہکی' دھیمے لب و لہجے میں ڈوبی ڈوبی' طول بیانی کی حامل دوسرے کی باتیں سوچی سمجھی' تاتاری لہجے' عجمی نے اور شان و شکوہ کا تاثر لئے ہوئے اور میر کی طول کلامی کے برعکس کفایت لفظی کا نمونہ۔ ایک کے یہاں رطب و یابس سے بھرے ضخیم دیوان تو دوسرے کے یہاں سراپا انتخاب کلام۔ ایک

کے یہاں غم و اندوہ کی جذباتی کسک' طعن و تشنیع کا زور' نالہ وشیون میں قیامت کا شور تو دوسرے کے یہاں غم کی فکری نوعیت' طعن و تشنیع کے بجائے لطیف ظرافت اور مزاح کی فراوانی اور فریاد کی بجائے ضبط فریاد کا یارا ------ ایک کے یہاں ہر غم کو غم جاناں بنانے کا سلیقہ تو دوسرے کے یہاں ہر غم کو غم زیست کا نقیب بنانے کا طریقہ ------ ایک کے یہاں تہذیبی اقدار کے زوال پر ماتم تو دوسرے کے یہاں تہذیبی شکست و ریخت سے عبرت کا اخذ و اکتساب اور نئی قدروں سے رابطے کی خواہش۔ ایک کے یہاں ناکامیوں کے باوصف محبت میں سلیقے سے نبھانے کا دعوی تو دوسرے کے یہاں دامن کو حریفانہ کھینچنے کی جرات۔ ایک کی عشق میں خود سپردگی اور عزلت پسندی تو دوسرے کی معاملات دل میں جارحیت پسندی اور محفل آرائی کا شوق۔ ایک کی طبیعت میں نازک مزاج شہاں تو دوسرے کے مزاج میں انکساری و شگفتگی کا رنگ ------ یہ وہ فنی و فکری فاصلے اور امتیازات ہیں جو میر اور غالب کو مختلف رویوں کے شاعر ثابت کرتے ہیں۔ لیکن ان ذہنی فاصلوں اور مختلف رویوں کے باوجود دونوں کے مشترک خصائص بھی کچھ کم نہیں۔

(۲)

عجیب اتفاق ہے کہ زمانی بُعد کے باوجود' دونوں شعراء کا زمانہ کم و بیش ایک سا ہے۔ قتل و غارت' لوٹ مار' انتشار' بے سکونی' اقتصادی بدحالی' سیاسی اور معاشی زوال' اقدار کی پامالی اور تہذیبی سطح پر شکست وریخت کا سلسلہ دونوں کی زندگی میں سامنے کے حوالے بن گئے۔ دلی کی بربادی کا نقشہ دونوں نے دیکھا اور دونوں اس پر ماتم کناں ہوئے۔ دونوں کی طبیعتوں میں احساس برتری اور احساس کمال خوب سمایا ہوا ہے۔ دونوں کو اپنے اپنے کمال فن کا زعم ہے اور یہ بے جا بھی نہیں) ایک کا تو (غالب) نسلی برتری کا احساس بھی کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ دونوں کے یہاں انفرادیت کا احساس بھی ہے اور اپنے منفرد انداز و اسلوب کا خیال بھی۔

دونوں میں مسلمات متعارفہ کی تردید و تضحیک کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے' دونوں میں تشکیک و تنقید کا رویہ پایا جاتا ہے اور دراصل یہ دونوں کے معاشروں کا اقتضا تھا' جو نئی نئی تبدیلیوں سے متعارف ہو رہے تھے۔ کیونکہ دونوں کے زمانوں میں مسلمہ اقدار میں شگاف پڑ چکے تھے اور دونوں حساس شاعران دراڑوں کو بنظر خود مشاہدہ کر رہے تھے۔ اس لئے دونوں کے یہاں تشکیک اور مسلمہ امور کے اضافی ہونے کا تاثر پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ دونوں ہنگامہ حیات کے متمنی اور دلدادہ تھے اس فرق کے ساتھ کہ میر ہنگامہ کرکے توجہ چاہتا ہے وہ رنگارنگ بزم آرائیوں کا ہنگامہ نہیں چاہتا بلکہ داغ فراق' حسرت وصل اور آرزوئے شوق کا ہنگامہ چاہتا ہے' جو زیر خاک بھی اس کے ساتھ جاتا ہے۔

داغ فراق و حسرت وصل' آرزوئے شوق
میں زیر خاک بھی یہی ہنگامہ لے گیا

یہ ہنگامہ ان کے دل کی ناصبوری کا ہے۔ یہ ہنگامہ ان کے نالوں کا ہے۔ یہ ہنگامہ ان کی راتوں کے شور و شر کا ہے جبکہ غالب کا ہنگامہ حرکت و عمل سے مربوط و مشروط ہے۔ یہ ہنگامہ زندگی کی رنگینیوں اور رنگارنگ بزم آرائیوں' عیش دوراں سے متمتع ہونے اور نظارہ ہائے حسن و جمال کے مزے لینے کا ہے۔ یہ ہنگامہ دشت نوردی' کوچہ گردی' زندگی سے مقاومت یا پھر زندگی کا رس کشید کرنے کے شوق کا ہے۔ یہ ہنگامۂ وحشت و جنوں کا ہے جس کی چارہ سازی احباب کے بس کی بات نہیں۔ پھر دونوں کے ہاں مکالمہ کرنے کا بہت شوق ہے کہ دونوں کے زمانے میں دلی شہر خموشاں بن چکا تھا۔ دلی کی ویرانی اور بربادی کا یہ عالم تھا کہ گھر کے گھر بے چراغ ہو چکے تھے۔ رنگارنگ بزم آرائیاں نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مکالمہ کرنے کو کوئی مخاطب نہ تھا سوائے اس کے کہ دونوں نے اشعار کے پردے میں مکالمہ کرکے اپنے جذبات کا کتھارسس کیا۔ دونوں بے حد حساس اور شدت جذبات کے حامل شاعر ہیں۔ دونوں کی حس بڑی تیز اور

متحرک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میر تندی کی طرف مائل اور غالب شعور و توازن کے قائل ہیں۔ جذبات کی شدت دونوں کے یہاں موجود ہے لیکن میر جذبوں کو فکر کی پرتوں کے بغیر ظاہر کرتے ہیں۔ جبکہ غالب جذبات کو فکری گہرائی میں سمو کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان مماثلتوں کے مقابلے میں دونوں کے درمیان فاصلے زیادہ ہیں۔

(۳)

اس میں شک نہیں کہ غالب نے میر کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف برملا کیا ان کی استادی کو تسلیم کیا اور ان کے دیوان کو گلشن کشمیر قرار دیا۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

تاہم ضروری نہیں کہ کسی شاعر کی استادی کا اعتراف کر کے اس کا مقلد بھی ہوا جائے۔ غالب میر کا معتقد ہونے کے باوصف اپنا ایک الگ اور منفرد رنگ رکھتا ہے۔ یوں مماثلتیں تلاش کرنا چاہیں تو کوئی سے دو شاعروں کے درمیان تلاش کی جا سکتی ہے۔ میر اور غالب کی مماثلتوں پر بھی کئی مضامین لکھے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے مضامین بھی شامل ہیں۔(۱) خود میں نے بھی اس مضمون میں ابھی دونوں شاعروں میں کچھ مماثلتوں کی طرف مجملاً" اشارہ کیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ہر بڑے شاعر کا رنگ منفرد ہوتا ہے اور محض اتفاق ہے کہ کبھی کبھی اس کے کچھ اشعار میں کسی قدیم شاعر کا رنگ دکھائی دے جائے۔ نقادان فن نے غالب اور اقبال کے درمیان بھی مماثلتیں تلاش کیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی ایک پوری کتاب اس موضوع پر ہے۔(۲) لیکن میرا نقطہ نظر اس کے برعکس ہے۔ میں نے غالب اور اقبال کے بارے میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ دونوں الگ الگ رنگوں اور مکتبہ ہائے فکر کے شاعر ہیں (۳) میر اور غالب کے بارے میں

Scanned by CamScanner

بھی میرا یہی خیال ہے کہ دونوں کا فن مختلف اسالیب کا حامل ہے۔ دونوں کا زندگی کے بارے میں رویہ مختلف ہے۔ دونوں کا فلسفہ حیات مختلف ہے۔ دونوں کا نظریہ فن مختلف ہے۔ میر کا مخاطب عوام ہیں۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر گفتگو مجھے عوام سے ہے

انہوں نے شعر کو سخن کا پردہ بنایا جس سے مقصود افشائے احوال تھا۔
انہوں نے شعر و شاعری کو شعار عاشقاں قرار دے کر اس پردے میں اپنا غم دل کہا۔

اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یارو شعار عاشق

غالب نے اپنی مشکل پسندی کی بدولت شعر کو اخفا کا ذریعہ بنایا اور اسی لئے وہ خواص کے شاعر ٹھہرے ان کے بیشتر اشعار دوہری معنویت کے حامل ہوتے ہیں۔ معنی کی تہہ داری جب پڑھنے والے پر منکشف ہوتی ہے۔ تو ایک نوع کا حظ حاصل ہوتا ہے۔ میر کے یہاں یہ تہہ داری بہت ہی کم ہے۔ ان کے اکثر اشعار یک رخے ہیں۔ ترسیل معنی کے لحاظ سے یہ اشعار آسان اور ہموار ہوتے ہیں۔ جب کہ غالب کے اشعار معنی کی ترسیل آسانی سے نہیں کرتے۔ بلکہ ذہن کو متحرک کرتے ہیں۔ اب ذرا دونوں کی زیست اور اسالیب زیست کے حوالے سے ان کے رویوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

حاشیہ

۱۔ "نقد میر" --- میں "غالب --- معتقد میر" اور "میر و غالب کی چند ہم طرح غزلیں" ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ ملاحظہ فرمائیے "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات"

۳۔ اسی کتاب کا تیسرا مضمون

Scanned by CamScanner

میر کی ذاتی حرماں نصیبیوں میں والد اور منہ بولے چچا میر امان کی وفات، سوتیلے بھائی کی بدسلوکی، محبت میں ناکامی، ماموں کی بے التفاتی، مالی مشکلات، ناقدر شناسی زمانہ، ہجرت کا دکھ شامل ہیں تو اجتماعی سطح پر اس دور کا عمومی زوال، سیاسی انتشار، طوائف الملوکی، خانہ جنگی، معاشرتی آشوب ---- یہ سب وہ موثرات ہیں جنہوں نے میر کی طبیعت میں افسردگی اور دردمندی کا سحر پھونکا۔ ان سب عناصر کی بدولت میر ایک غم زدہ، الم پسند انسان بن گئے جن کی ساری زندگی رونے یا رلانے میں گزری۔

یا روئے یا رلائے اپنی تو یونہی گزری
کیا ذکر ہم صفیراں یاران شادماں کا

دیکھا ماتم خانہ عالم کو ہم مانند ابر
ہر جگہ پر جی میں یوں آیا وہا دم روئیے

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
غم کے جانے کا نہایت غم رہا

اسی آشوب ذات اور آشوب زیست کی بدولت ان کی آنکھ ہمیشہ نم ناک رہی۔ ان کا ہاتھ دل پر، لب خشک اور رنگ زرد رہا۔ آنکھیں یوں امڈتی رہیں جیسے دریا امڈتے ہیں۔ بے دماغی، بے قراری، بے کسی اور بے طاقتی ان کے روگ تھے جن کی وجہ سے جینا حرام تھا۔

ہمیشہ چشم ہے نم ناک ہاتھ دل پر ہے

خدا کسی کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نم ناک چشم، خشک لب و رنگ زرد تھا

امڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جئیں وہ جن کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں

ان کی ساری جوانی دردمندی میں کٹی اور جو نئی ٹھیس لگی آبلے کی طرح پھوٹ بہے۔ انھیں ہمیشہ یہ احساس رہا کہ وہ اس باغ خزاں دیدہ میں برگ خزاں کی مانند رہے۔

ہوں زرد غم تازہ نہالان چمن سے
اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں

ساری ساری رات رونا ان کا روزگار ٹھہرا۔

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

یہ کیفیت کوئی ایک شب کی نہیں بلکہ میر کی ہر رات اسی انداز سے گزری۔

رات گزری ہے مجھے نزع میں روتے روتے
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے

اور پھر صبح کی حالت دیکھیے وہ بھی رات سے کم نہیں۔

Scanned by CamScanner

وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں
خندہ صبح چمن پر مثل شبنم رویئے

یا

دم صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

غم کی اس ذاتی نوعیت کے حوالے سے میر کے اشعار میں افسردگی' مایوسی اور گریہ وزاری کے مضامین کی بھرمار ہے۔ ان تمام اشعار میں غم کی جذباتی نوعیت ہے فکری نہیں' اجتماعی غم کے حوالے سے ان کے اشعار میں سیاسی انتشار اور آشوب دہر کے مضامین بھی عام ہیں۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج وتخت کا

چور اچکے' سکھ مرہٹے' شاہ وگدا سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے یاں

اب شہر ہر طرف سے ویران ہو رہا ہے
دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے

شہر کی اس ویرانی نے انہیں اس قدر دل برداشتہ کیا کہ پھر ان کا جی ان اجڑی بستیوں میں نہ لگا اور انہوں نے ویرانیوں میں جا بسنے کی تمنا کی۔

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا

ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ---جہاں قدم قدم پر گھر تھا وہاں آج خرابہ آباد ہو گیا ہے۔

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

میر مضامین غم کے لئے جو پیرایہ اظہار اختیار کرتے ہیں اس میں بھی ایسی تشبیہوں' استعاروں اور علامتوں کی بھرمار ہے جن میں ویرانیوں' اجڑی بستیوں' برباد نگروں' خرابوں' مزاروں' گور غریباں' بے ثباتی دنیا' فنا' مرگ' آشوب ہستی' عدم' موت' سراب' غبار' آگ اور خون کے حوالے عام ہیں۔

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

Scanned by CamScanner

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں ایک داغ
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دنیا اس کا قرار پایا

دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے
جو ہے سو کوئی دم کا فیصل ہے

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کر شہر سے تک سیر کر مزاروں کا

تک گور غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہو گا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

(۵)

اب ذرا غالب کے یہاں آشوب ذات اور آشوب زیست کی نوعیت دیکھیے خود لکھتے

ہیں۔

"ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا..... برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلا د شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ پھر اس مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ..... سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا ..... پھر پکڑا آیا اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا ----؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو؟"

(جون ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا خط)

"خدا کا مقہور' خلق کا مردود' بوڑھا' ناتواں' بیمار' فقیر' نکبت میں گرفتار ..... میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں"

(۱۳ فروری ۱۸۶۵ء کا لکھا ہوا خط)

ان اقتباسات میں ان کی حرماں نصیبیوں کا تھوڑا سا رنگ اور بھر دیجئے کہ بچپن میں یتیمی کا داغ' بے اولادی کا غم' کوتوال شہر کے ہاتھوں اسیری' اقتصادی بدحالی' جاگیروں کی ضبطی' اپنے مقابلے میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوق کی فوقیت اور امتیاز---

پھر اس دور میں سیاسی' معاشرتی اور اقتصادی بدحالی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ غالب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات' اثرات اور نتائج اپنی زندگی میں دیکھے اور محسوس کئے تھے خود ان کی ذات ان حالات کا شکار ہوئی۔ شہر خالی ہو

Scanned by CamScanner

گیا محفلیں برہم ہو گئیں معاشی بدحالی حد سے بڑھ گئی۔ ادھر بڑھاپے کا زور ہوا۔ سامعہ مرگیا۔ باصرہ ضعیف ہو گیا۔ قویٰ مضمحل ہو گئے حواس سراسر مختل، حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں، چراغ دم صبح اور آفتاب سرکوہ ہو کر رہ گئے۔

یہ سب حوالے مل کر غالب کو میر سے کچھ کم غم زدہ ثابت نہیں کرتے لیکن "الم پسندی" کے سلسلے میں دونوں کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ میر کے غم کی نوعیت اشعار کے حوالے سے بیان کی جا چکی ہے۔ غالب بھی غم کو زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت تصور کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں غم سلبی یا منفی شکل بہت کم اختیار کرتا ہے۔ وہ غم کو ایک جاں گسل شے سمجھتے ہوئے بھی اسے ناگزیر جذبہ تصور کرتے ہیں غم بہرحال زندگی کا لازمہ ہے وہ خواہ غم عشق کی صورت میں ہو یا غم روزگار کی شکل میں۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اگر یہ عشق ہے تو ایک DYNAMIC جذبہ ہے بلکہ ایسا جذبہ بے اختیار ہے کہ سینہ شمشیر سے دم شمشیر باہر اُڈا چلا آتا ہے یہ عشق بے مزہ کرنے والا نہیں بلکہ اس میں زیست کا مزا پوشیدہ ہے اور یہ ہر دور کی دوا ہے جبکہ خود درد لادوا ہے۔ اس معاملے میں غالب کی ہمت دشوار پسند ہے جو عشق میں فنا کے عمل کو بھی آسان بنا لیتی ہے اور اس کا سبب غالب کا حوصلہ ہے غالب کے لئے دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہیں بنتا اس لئے نہیں کہ یہ لفظ شرمندہ معنی نہیں ہوتا بلکہ اس لئے کہ خود غالب وفا سے زیادہ "جفا" کو پسند کرتے ہیں۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست وبازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ

مجھ کو حریص لذت آزار دیکھ کر

جراحت تحفہ' الماس ارمغاں' داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد' غم خوار جان درد مند آیا

عشرت پارہ دل' زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر' غرق نمکداں ہونا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں' کہ ہے
پُر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذت سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

غالب جانتے ہیں کہ زندگی مشکلات میں جینے کا نام ہے۔ اس لئے وہ ناساعد حالات سے گھبراتے نہیں برق کی عبادت کرنے والے حاصل کا افسوس نہیں کرتے۔

سراپا رہن عشق وناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یہی وجہ ہے کہ غالب کا سینہ جو "دفینہ گہرہائے راز" ہے اگر تاراج کاوش غم ہجراں ہو جائے تو پھر بھی انہیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ آہ سے زیادہ ضبط آہ میں اپنا

Scanned by CamScanner

صرف ڈھونڈتے ہیں ورنہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان میں ضبط کا یارانہ ہو تو ایک ہی نفس جاں گداز کا طعمہ بن جائیں۔ وہ غم عشق کی تمام کیفیتوں کا شعور ہی نہیں رکھتے غم دینے والے اور غم سہنے والے کا فرق بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ اس فرق میں دونوں کے مقام، دونوں کے حقوق اور دونوں کی مراعات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس لئے جب وہ دونوں کی متضاد حالتوں کا بیان کرتے ہیں تو شکوہ وشکایت سے زیادہ تسلیم ورضا، بے حوصلگی سے زیادہ حوصلہ مندی اور شور وشغب سے زیادہ سنجیدگی اور متانت کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام
گریے سے یاں پنبہ بالش کف سیلاب تھا
جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا
یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی
جلوۂ گل واں بساط صحبت احباب تھا

ہمت عالی کا حوصلہ دیکھئے کہ اپنے گھر کی بربادی کے سیلاب کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانہ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

یا

نہ پوچھ بے خودی عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در ودیوار

لیکن دوسروں کی بربادی کا خیال آتے ہی سیل گریہ پر بند باندھ دیا جاتا

ہے۔

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

یہ حوصلہ غالب ہی کا ہے جو اپنی بربادی کا سامان تو کر سکتے ہیں دوسروں کی نہیں، وہ عیش میں نالہ نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ اس میں حسن طلب چھپا ہوتا ہے۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

(۶)

میں نے ابھی کہا کہ غالب عشق کو ہستی کے لئے ایک ناگزیر جذبہ تصور کرتے ہیں۔ میں اس میں اب اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ صرف عشق کو نہیں بلکہ غم عشق کو اور بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ عشق کا جوہر غم ہے جو ایک حقیقی تجربہ اور ایک قدر بن جاتا ہے۔ یہ کم ہوئے پر بھی غم روزگار کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور یہ غالب کا اپنا تجربہ ہے۔

کم جانتے ہیں ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

اس لئے تو غالب دل کو دونیم، مژہ کو خوں چکاں، سینہ کو آتش کدہ اور نفس کو آذر فشاں بنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہیں
ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

Scanned by CamScanner

اگر عشق میں "رنج نومیدی جاوید" ملے تب بھی انہیں کوئی رنج نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ پانا ان کے لئے معراج نہیں۔ طلب میں لذت بھی ہے اور امکان بھی۔ اس لئے تو یک بیاباں ماندگی سے بھی ان کا ذوق کم نہیں ہوتا۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجہ رفتار ہے نقش قدم میرا

اسی طرح دشت میں عیش کا سبب اس کی وسعت کا احساس ہے ورنہ گھر کی خرابی بھی کچھ کم نہیں۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

ذوق دشت نوردی کی انتہا یہ کہ

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

غم عشق کی یہ وسعت طلبی، ذوق دشت نوردی، شوق آبلہ پائی اور دار و رسن کی آزمائش سے گزرنے کا حوصلہ غالب کی ہمت دشوار پسند کے معمولی اوصاف ہیں۔ اس لئے تو دنیا انہیں بازیچۂ اطفال، اورنگ سلیماں معمولی کھیل اور اعجاز مسیحائی محض ایک بات نظر آتی ہے صحرا ان کے ہوتے گرد میں نہاں ہونے لگتا ہے اور دریا ان کے آگے خاک پہ جبیں گھسنے لگتا ہے۔ قلزم خوں ان کے سامنے موجزن ہو تو وہ کچھ اور کی طلب کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ سارا عالم انہیں کف خاک اور آسمان بیضہ قمری دکھائی دینے لگتا ہے۔

نالہ سرمایہ یک عالم وعالم کف خاک
آسمان بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے

اس طرح جوش جنوں کی بدولت صحرا انہیں مشت خاک نظر آنے لگتا ہے۔

Scanned by CamScanner

جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اور
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے

میر میں زندگی کی مقاومت کا وہ حوصلہ نہیں جو غالب میں ہے۔ میر امکانات یا ذوق عمل کا شاعر نہیں غالب امکانات کا شاعر ہے۔

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ' اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان کا عشق بھی حرکی ہے اور فلسفہ زندگی بھی حرکت و عمل سے عبارت ہے اس لئے ان کے یہاں جو علامتیں' استعارے اور تمثالیں استعمال ہوتی ہیں وہ بھی عموماً حرکی ہوتی ہیں۔

اثر آبلہ سے جادہ صحرائے جنوں
صورت رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

ہر قدم دورئی منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

Scanned by CamScanner

گلیوں میں مری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادہ ہوائے سرِرہ گزار تھا

احباب چارہ سازئی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

دراصل دونوں شاعر ذاتی کرب اور آشوب زیست کے اظہار کے لئے مختلف رویے اختیار کرتے ہیں --- میر بے تابی کا، گریہ پیہم کا، شکوہ و شکایت کا لیکن غالب حوصلے کا، مقاوت کا اور شگفتہ مزاجی کا --- میر غم کے ذائقے کو ناگواری اور تلخی سے برداشت کرتے ہیں جبکہ غالب اس ذائقے کو گوارا بنا لیتے ہیں۔ بلکہ اس کے امکانات کی دریافت میں لگ جاتے ہیں۔

(۷)

میر کے یہاں زندگی کے بارے میں سلبی نظریات زیادہ ہیں۔ چنانچہ وہ زندگی کو عیش گاہ تصور نہیں کرتے بلکہ چمن زیست کے ہر گل کو لہو بھرا ساغر خیال کرتے ہیں۔ بزم جہاں کی دلکشی پر طنز کرتے ہوئے یہاں سے جانے والے ہر شخص کو غم دیدہ، رنج کشیدہ اور سراپا حسرت گردانتے ہیں۔ بلکہ وہ زندگی کو حقیقی سمجھتے ہی نہیں۔ اگرچہ تصوف کے اثرات کی بنا پر میر اور غالب دونوں زندگی کی حقیقت کے بارے میں ہم خیال ہیں۔ اسے محض توہم کا کارخانہ اور حلقہ دام خیال جانتے ہیں تاہم دونوں کا دنیا اور زندگی کے بارے میں رویہ مختلف ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے

Scanned by CamScanner

میر منفی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اپنے جی کے جانے کا اندوہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ دنیا سے جا رہے ہیں اور زندگی کے خاتمے کا انہیں افسوس ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ حشر کے دن پھر اٹھنا پڑے گا۔ گویا وہ زندگی کے مقابلے میں مرنے اور ہمیشہ کے لئے فنا ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ انسان کو تقدیر کے آگے اتنا بے بس سمجھتے ہیں کہ دنیا کی شطرنج پر اسے ایک بے جان مہرہ تصور کرتے ہیں جس کو دنیا کے سیاہ وسپید میں صرف اتنا دخل ہے کہ رات کو رو رو کر صبح اور دن کو جوں توں شام کرتا ہے۔ میر جہاں کے مجمعے کو مجلس رواں اور دنیا کے خرابے میں قصد تعمیر کو بیکار خیال کرتے ہیں اس لئے کہ یہ بے بنیاد دہر رہ گزر سیل حوادث ہے۔ منعم کو فکر خانہ سازی سے اس لئے دور رکھنا چاہتے ہیں کہ زندگانی کی بنیاد ناپائیدار ہے۔ ان کے نزدیک سعی کا حاصل سوائے موت کے کچھ نہیں۔ اس لئے وہ زیست کو نہایت کم ترچیز تصور کرتے ہیں ہر آن مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عالم پر غبار ہے۔ یہاں سوائے خاک پھانکنے کے اور کوئی کام نہیں۔ اس عالم میں جز کش مکش کوئی فائدہ نہیں بلکہ یہ تو ایک بے فضا قفس ہے جس میں ہم گرفتار ہیں اس لئے یہاں سے کوچ کرنا ہی بہتر ہے۔ یوں بھی بود آدم نمود شبنم ہے جو ایک دو دم میں ہوا ہو جاتی ہے۔ گویا اس جہان فانی کا جینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ تو ایک عجیب مقتل ہے جہاں کوئی دم میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے میر ہمیشہ ذوق فنا میں محو رہتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کوئی خوش رہتا ہے یا ناخوش۔ دامن عزلت لینے کی وجہ بھی یہی ہے کہ میر نے اپنا دل مرگ سے آشنا کر لیا۔ چشمہ آب زندگانی کو خاک سے بھر دیا۔ گویا ان کے نزدیک اس خاکدان کا حاصل بجز کدورت اور کچھ نہیں۔ یہ ایسے بے فضا قفس کی مانند ہے جس میں مطلق ہوا نہیں ہے اس لئے وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو دامن جھٹک کر یہاں سے اٹھ گئے کیونکہ یہ دنیا رہنے کے قابل ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ہستی تو ننگ عدم ہے اب ذرا ان تصورات کو اشعار کے آئینے میں دیکھئے۔

Scanned by CamScanner

عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

وہم جس کو محیط سمجھا ہے
دیکھیے تو سراب ہے وہ بھی

کیا دلکش ہے بزم جہاں کی جائے یاں سے جس کو دیکھو
وہ غم دیدہ، رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے

جز کش کمش ہووے تو کیا عالم سے ہم کو فائدہ
یہ بے فضا ہے اک قفس ہم ہیں گرفتار اس قدر

جی. تو جانے کا ہمیں اندوہ ہی ہے پر ایک میر
حشر کو اٹھنا پڑے گا. پھر یہ اک غم اور ہے

جہاں شطرنج، بازندہ فلک، ہم تو ہیں سب مہرے
بسان شاعر نو، ذوق اسے مہروں کی زد سے ہے

اک گل زمین نہ وقفے کے قابل نظر پڑی
دیکھا برنگ آب رواں یہ چمن تمام

کم فرصتی جہاں کے مجمعے کی کچھ نہ پوچھ
احوال کیا کہوں اس مجلس رواں کا

رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

سب فکر خانہ سازی میں منعم ہلاک ہیں
بنیاد زندگانی کی ناپائیدار ہے

فکر تعمیر میں نہ رہ منعم
زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد

ہم اب ناتوانوں کو مرنا ہے صرف
نہیں وہ کہ جینا بھی منظور ہے

ہے زیست کوئی یہ بھی جو میر کرے ہے تو
ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجئے

بود آدم نمود شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

کوہ وصحرا میں کر نہ جائے باش
آج تک کوئی بھی رہا ہے یاں

جیو خوش یا کوئی ناخوش ہمیں کیا

Scanned by CamScanner

ہم اپنے محو ہیں ذوق فنا میں
دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے
جو ہے سو کوئی دم کا فیصل ہے

تھا چشمہ آب زندگانی نزدیک
پر خاک سے اس کو بھر دیا میں نے

زیر فلک رکا ہے اب جی بہت ہمارا
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے

حاصل بجز کدورت اس خاکداں سے کیا ہے
خوش وہ کہ اٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر

رہنے کے قابل تو ہرگز تھی نہ یہ عبرت سرا
اتفاقاً اس طرف اپنا بھی آنا ہو گیا

شبنم کی سی نمود سے تھا میں عرق عرق
یعنی کہ ہستی ننگ عدم تھی خجل گیا

(۸)

میر کے برعکس غالب کے یہاں زندگی سے بھرپور لگاؤ کا اظہار ملتا ہے اس
میں شک نہیں کہ غالب بھی دنیا اور زندگی کو بے حقیقت تصور کرتے ہیں ا

Scanned by CamScanner

عارضی اور فانی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ دراصل تصوف کے روایتی نظریات کی بدولت ہے ورنہ اپنے جذباتی اور فکری رویوں کے مطابق وہ دنیا اور زندگی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دنیا کو بے کارشے تصور کرنے اور زندگی کو بے کار گزارنے کا مشورہ ان کے پاس اس طرح نہیں ہے جس طرح میر کے یہاں ہے۔ وہ تو زندگی کو پرلطف بنائے رکھنے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا عملی سبق دیتے ہیں وہ دنیا کو ایک حسین اور دلکش جگہ تصور کرتے ہیں جہاں زندگی کے سارے مزے موجود ہیں اور غالب ان سے متمتع ہونا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اور جب بقدر ذوق ان سے لذت اندوز نہیں ہو سکتے تو حسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ غالب کے لئے ساز زندگی کے سارے نغمے فردوس گوش ہیں یہاں تک کہ وہ تو نغمہ ہائے غم کو بھی غنیمت تصور کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک نہ ایک دن ساز ہستی کو بے صدا ہو جانا ہے۔ چنانچہ اس ساز سے جتنے نغمے پھوٹیں خواہ وہ خوشی کے ہوں یا غم کے، ان سے لطف اندوز ہونا زندگی کی بیش بہا نعمت ہے۔ دراصل غالب زندگی سے متمتع ہونے اور لطف اٹھانے کا اتنا بھرپور تصور رکھتے ہیں کہ کسی اور شاعر کے یہاں یہ ذوق وشوق دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے تمام قوی مضمحل ہو جائیں۔ ہاتھوں کو جنبش نہ رہے لیکن آنکھوں میں دم باقی ہے تو ان میں ہوس ناؤ و نوش باقی رہتی ہے اور ساغر و مینا کو آنکھوں سے دور ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ زندگی سے اس قدر لگاؤ اس شخص کو ہو سکتا ہے جو زندگی کا بھرپور تصور رکھتا ہو۔ میر کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔

غالب تو رنج نو میدی جاوید کو بھی گوارا بنا لیتے ہیں تاکہ ان کا نالہ زبونی کش تاثیر نہ ہو۔ زندگی کی کش مکش میں خوشی ہو یا غم وہ حوصلے کے ساتھ جینا اپنا آدرش سمجھتے ہیں گویا وہ سکون سے زیادہ بے قراری، امید سے زیادہ ناامیدی کو اور پانے سے زیادہ پانے کی خواہش کو اہمیت دیتے ہیں وہ زندگی کی الفت سے گریزاں نہیں ہوتے بلکہ جو لوگ زندگی کی الفت سے دور بھاگنے کا دعوی کرتے ہیں غالب ان کو رد کر دیتے ہیں اور ان کے پاس اس کا جواز بھی ہے۔

Scanned by CamScanner

الفت گل سے غلط ہے دعوی وارستگی
سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

زندگی کا بھی یہی چلن ہے کہ وہ آزادی اور گرفتاری کے دوہرے عمل کی گرفت میں ہے۔ رنگ طرب ہو یا غم محرومی دونوں میں تلون پایا جاتا ہے۔ اس لئے دونوں کو برداشت کرنا اور حوصلے سے زندگی گزارنا صحت مند نظریہ حیات کے عین مطابق ہے یہی رویہ غالب کا ہے۔ وہ زندگی کی رنجوری سے گھبراتے نہیں بلکہ اس کو گوارا بنانے کا ذوق رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کا یہ ذوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ جب ان کا تن رنجور عشق پر عربدہ کو برداشت نہیں کر سکتا تو انہیں حسرت ہوتی ہے کہ انکا ذوق خرابی مطمئن نہیں ہو سکے گا کیونکہ وہ تو زمانے سے آزار کی توقع زیادہ رکھتے تھے جبکہ زمانہ سخت کم آزار نکلا۔ یہ حوصلہ غالب کا ہے جو طوفان حوادث کو اہل بینش کے لئے مکتب کا درجہ دیتے ہیں اور لطمہ موج جن کے لئے سیلی استاد سے کم نہیں۔

غالب اگر کبھی زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے بھی ہیں' کاروبار شوق کی فرصت یا نظارہ جمال کا ذوق کبھی انہیں باقی نہیں بھی رہتا تو صرف اس لئے کہ یہ سب ایک شخص کے تصور سے وابستہ تھا۔ جب وہ نہ رہا تو رعنائی خیال بھی نہ رہی یعنی دنیا کا حسن محبت کا رہین منت ہے اس کے بغیر کچھ نہیں۔ گویا غالب رونق ہستی کو عشق خانہ ویراں ساز سے وابستہ کرتے ہیں۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یہاں تک کہ مدفن میں جا کر بھی جلوہ گل کی نظارگی کا سامان موجود رہتا ہے بشرطیکہ مرنے والا بہار ناز کا مارا ہوا ہو۔ گویا حسن کا جلوہ زندگی ہی کو نہیں موت کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔ غالب موت کو بدہیت یا بدوضع شے نہیں سمجھتے بلکہ اسے قابل قبول بنا دیتے ہیں۔ زندگی اور موت دونوں کے ساتھ حسن کی وابستگی کا تصور

Scanned by CamScanner

غالب کو حسن خیال اور حسن عمل کا شاعر بنا دیتا ہے۔

میر کے برعکس غالب دنیا کو ایک بہشت تصور کرتے ہیں۔ کوچہ محبوب ان کے نزدیک جلوہ گری میں بہشت کا نقشہ پیش کرتا ہے بلکہ رونق اور آبادی کے لحاظ سے اس سے کہیں زیادہ ہے۔ غالب دنیا کے حسن و جمال سے اپنا دامن بھر لینا چاہتے ہیں ان کے ظرف میں اتنی وسعت ہے کہ دونوں جہاں لے کر بھی خوش نہیں ہوتے۔ اقبال کی طرح ان کا دامن بھی بہت پھیلا ہوا ہے۔ وہ کم پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اور کی تمنا کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس لذت آزار عشق کو سہنے کی طاقت نہیں اور آزار عشق کے بغیر زندگی کا کاٹنا ناممکن ہے۔ کیونکہ عشق ہی تو زندگی کا جواز ہے۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں
طاقت بہ قدر لذت آزار بھی نہیں

اسی لئے تو ان کے خون کا ہر قطرہ سیہ ہو کر سویدا بن جاتا ہے اور یوں انہیں جوش جنون عشق کے ہاتھوں ہزاروں دل حاصل ہو جاتے ہیں جن کی بدولت وہ زندانی تاثیر الفت ہائے خوباں بن کر رہ جاتے ہیں۔

ہزاروں دل دیئے جوش جنون عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خون تن میں
اسد زندانی تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

لیکن عشق کی غارت گری کے آگے سب کچھ لٹانے کے باوجود شرمندگی کے احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اب غارت گری کے لئے گھر میں کچھ بھی نہیں سوائے حسرت تعمیر کے گویا غالب زندگی کو عشق سے مشروط کر کے اس کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔

معاشرتی تحریمات کی رو سے جن لذائذ زیست کو معاصی کا نام دیا جاتا ہے۔

غالب ان میں ڈوب جانا چاہتے ہیں لیکن انہیں افسوس اس بات کا ہے کہ ان کا سر دامن بھی ابھی تر نہیں ہوتا کہ دریائے معاصی تنک آبی سے خشک ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں غالب کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ بہ قدر حسرت دل ان کا ذوق معاصی کم ہے کیونکہ اگر ان کا بس چلے تو وہ ہفت دریا کے آب سے محض یک گوشہ دامن بھر لیں پورے دامن کی وسعت کی تو بات ہی اور ہے۔

بہ قدر حسرت دل چاہیے ذوق معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آب ہفت دریا ہو

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کا داغ کا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذرہ ذرہ ساغر مے خانہ نیرنگ ہے
گردش مجنوں بہ چشمکہائے لیلی آشنا

شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

Scanned by CamScanner

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

شرح ہنگامہ ہستی ہے زہے موسم گل
رہبر قطرہ بہ دریا ہے خوشا موج شراب

ایسا شوق گناہ اور ذوق معاصی غالب کے علاوہ کس میں ہو سکتا ہے---؟ غالب ایک وسیع المشرب انسان ہیں طاعت و زہد کی طرف ان کی طبیعت نہیں آتی۔ وہ ایک ایسے موحد ہیں جنکا کیش ترک رسوم ہے۔ حسد و کینہ سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کا تجربہ ہے اور کتنا صحیح ہے کہ اگر حسد سے دل افسردہ ہو جائے تو حاسد کو گرم تماشا ہو جانا چاہئے کیونکہ کثرت نظارہ پر چشم کو وار کھنا غالب کی زندگی کا بڑا نمایاں رویہ ہے ان کے خیال میں بس مژگان اٹھانے کی دیر ہے کہ صد جلوہ روبرو نظر آنے لگتا ہے۔ ان کے مقابلے میں میر بزم جہاں کو دلکش تصور نہیں کرتے اس لئے اس پر چشم وا کرنے کے بجائے آنکھیں موند لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہے پر غبار عالم، جانا ہی یہاں سے اچھا
اس خاکداں میں رہ کر کیا کوئی خاک پھانکے

وہ تو "بزم خوش جہاں" سے دامن عزلت لے لیتے ہیں اور اپنے دل کو زندگی کے بجائے موت سے آشنا کر لیتے ہیں۔

دامن، عزلت کا اب لیا ہے میں نے
دل، مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے

اس لحاظ سے غالب حیات کے اور میر موت کے شاعر ہیں۔ اب ذرا غالب کے انہی تصورات کو اشعار کے حوالے سے دیکھئے۔

Scanned by CamScanner

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

کچھ نہ کی اپنے جنون نارسا نے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکش خورشید عالمتاب تھا

ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوہ ناز

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے
مینائے بے شراب ودل بے ہوائے گل

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

حسرت اے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشق پر عربدہ کی گوں تن رنجور نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے کی بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

ٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

Scanned by CamScanner

ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

نشہ شاداب رنگ و ساز مست طرب
شیشہ مے، سرو سبز، جوئبار نغمہ ہے

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستان کے ہم و لے
کیونکر نہ کھایئے کہ ہوا ہے بہار کی

(۹)

میرا خیال ہے میں نے اپنی گفتگو میں اپنے موقف کی وضاحت کر دی ہے۔ صرف ایک آخری بات یہ کہ اگر میرے موقف کا عملی تجزیہ اور تجربہ کرنا چاہیں تو دونوں شاعروں کے دواوین کا مطالعہ الگ الگ کر لیجئے۔ میر کا کلام پڑھتے ہوئے ایک بالکل مختلف تاثر اور جذبہ آپ میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہو گا۔ جبکہ غالب کی شاعری ایک دوسری قسم کی کیفیت آپ پر طاری کر دے گی چونکہ بات صرف آہ اور واہ تک محدود نہیں اس لئے ان دونوں مختلف اور متبائن کیفیتوں کو کسی ایک جملے یا دو لفظوں یں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میں اپنے موقف کو پھر دہراتا ہوں کہ میر اور غالب کے شعری تناظر مختلف ہیں۔ ان کے ذہنی رویے اور فاصلے مماثلتوں اور قربتوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہیں۔

Scanned by CamScanner

میں ۔ معترف میر

میں میر تقی میر کی عظمت اور استادی کا معترف و معتقد اس وقت سے ہوں جب ایم اے اردو کی تعلیم کے دوران کلام میر کے عظیم شارح اور مداح استاد گرامی ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے وہ لیکچر سنتا تھا جو میر کے منفرد رنگ تغزل کا نقش دل پر بٹھا دیتے تھے اور استاد محترم کی طرح طلبہ وطالبات بھی "سودائی" نہیں "میری" بننا پسند کرنے لگتے تھے۔ لیکچر کے دوران یوں محسوس ہوتا تھا کہ میر سید صاحب پر وارد ہو رہے ہیں اور ان کی ڈوبی ہوئی گفتگو کے ذریعے سے خود ہم سب کو اپنی گرفت میں لے رہے ہیں۔ رنگ میر کی سحر انگیزی اور اس کے سامنے اپنی مغلوبیت کو پہلے تو میں نے اپنے بے مثل استاد کی سحر گفتاری اور میر پسندی کا اعجاز سمجھا لیکن جب خود کلام میر کا مطالعہ کیا تو میر کا سحر دو چند ہو گیا اور اب مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ میر اپنے رنگ کے یکتا اور بے مثل شاعر ہیں۔ اس لئے نہیں کہ قائم نے انہیں "شمع انجمن عشق بازاں" اور فروغ محفل سخن پردازاں کہا یا لچھمی نرائن شفق نے "میر میدان سخنوری" تسلیم کیا یا میر حسن نے شاعر دل پذیر اور شیفتہ نے اشعر شعراء قرار دیا یا مجنوں گور کھپوری نے "خدائے سخن" اور مولوی عبدالحق نے "سرتاج شعرائے اردو" کہہ کر پکارا بلکہ اس لئے کہ انسانی

جذبات و محسوسات کا جتنا تنوع میر کے کلام میں دکھائی دیتا ہے اتنا شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں ملتا ہو۔ پھر میر نے ان محسوسات کو جس دھیمے، پر تاثیر اور نرم لہجے میں ڈھالا ہے وہ بے مثال ہے۔ میر ایک دروں بین (INTRO VERT) شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سوز وگداز اور جذبہ واحساس کی گرمی اور شدت ملتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے خلوص کی پیداوار ہے یہ اس درد وغم سے عبارت ہے جو میر کی زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے اس لئے کہ اس درد وغم نے ان کے کلام میں وہ تاثیر بھر دی جس نے ہر زخمی دل کو مرہم فراہم کیا۔ اس شاعری کو پڑھ کر طبیعت سکون کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جذبوں کی تطہیر ہوتی ہے نغمگی سے بھری لے اور نرماہٹ، مزاج کو صوفیانہ رنگ میں رنگ دیتی ہے بلاشبہ میر کا مزاج صوفیانہ تھا اس میں بچپن کی تربیت کا اثر بھی تھا اور زمانے کے دکھ درد کا اثر بھی یہی وجہ ہے کہ میر کے لئے شاعری ذہنی ورزش کا ذریعہ نہ تھی بلکہ انہوں نے دل اور جگر کا خون کیا اور اسی کی نمود نے ان کی شاعری میں بے پناہ تاثیر بھر دی۔ کلام میر سوزوگداز، درد وغم اور نشتریت سے بھرپور ہے، اداس ضرور کرتا ہے لیکن اس میں مریضانہ گھٹن کا احساس نہیں ہوتا اس لئے ہر پڑھنے والا اس میں دلچسپی لیتا اور اپنے دل کی آواز پہچانتا ہے۔ یہ غم انگیز شاعری ہمارے زخموں پر پھاہے رکھتی ہے اور ہمیں سکون پہنچاتی ہے۔ یہ ہمارے دکھ درد، خوف اور ترحم کے جذبوں کا کتھارسس کرتی ہے سبب ظاہر ہے کہ آج کے انسان کو فنا کا شدید احساس لاحق ہے آج تشخص اور پہچان ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے دکھ درد کے کتنے حوالے ہماری زیست کے درپے ہو گئے ہیں ہلاکت اور تباہی کے دہانے پر کھڑی ہوئی دنیا میں آج کا انسان جس طرح موت اور بربادی کے احساس میں شدت سے مبتلا ہے تنہائی اور ریدیعنیت کا کرب جس طرح ہم سب کی زندگیوں میں نقب زنی کر رہا ہے اس سے کون واقف نہیں ایسے وقت میں میر کے شعر جذبوں میں پھیلتے اور وجود میں سرایت کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ علاج بالمثل کی طرح ہمارے جذبوں

Scanned by CamScanner

کو شدید تر (INTENSIFY) کر کے ان کی تطہیر کرتے اور سکون پہنچاتے ہیں دراصل میر کو بھی ایسا ہی زمانہ نصیب ہوا تھا جب ہر طرف انتشار، بے سکونی، خوف، قتل وغارت، لوٹ مار اور خود غرضی کا دور دورہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میر نے دل کی دنیا میں پناہ لی جس طرح آج ہمارا خارجی حوالہ کرب ناک اور دہشت انگیز ہے --- میر کے دور کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی اور اس لئے میر نے دل کو وسیع صحرا تصور کر کے اس میں تحفظ ڈھونڈا۔ باہر کی دنیا کی حالت تو یہ تھی کہ

جز کش کمش ہوئے تو کیا عالم سے ہم کو فائدہ
یہ بے فضا ہے اک قفس ہم ہیں گرفتار اس قدر

رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

سب فکر خانہ سازی میں منعم ہلاک ہے
بنیاد زندگانی کی ناپائیدار ہے

ہے زیست کوئی یہ بھی جو میر کرے ہے تو
ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجئے

زنہار نہ جا پرورش دور زماں پر
مرنے کے لئے لوگوں کو تیار کرے ہے

Scanned by CamScanner

کیا یہ سب اشعار ہماری زیست کی بے ثباتی کا حوالہ نہیں بن جاتے؟

ظاہر ہے مہلک ہتھیاروں کی دوڑ' سپر پاورز کے استحصالی ہتھکنڈوں اور آشوب زیست نے انسانی زندگی کی بے ثباتی کا احساس اس قدر نمایاں کر دیا ہے کہ ہم بھی میر کی طرح دل کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں ہمیں میر کی آواز اپنے ہی دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ میر جب سر کو گریبان میں ڈالنے کی تلقین کرتے ہیں تو اس لئے کہ دل ایک دامن وسیع صحرا ہے جہاں سکون میسر آسکتا ہے۔

ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
دل بھی دامن وسیع صحرا ہے

میر کے نزدیک دل محض وسعت پذیر ہی نہیں بلا خیز بھی ہے' طوفاں بردوش بھی ہے' نسخہ تصوف بھی ہے' متاع بے بہا بھی ہے' طریق عشق میں رہنما بھی ہے --- لیکن اس دل کی پہچان کے لئے چشم بصیرت کا ہونا ضروری ہے۔ میر کے خیال میں فن عشق کے مشکل حقائق کی آگاہی کے لئے دل کا مطالعہ لازمی ہے۔ دل آئینہ عالم ہے جو ہر شے کو چشم معرفت پر منعکس کر دیتا ہے۔ دل اک قطرہ خون ہے جو ایک عالم کے سر بلا لاتا ہے یہ نہ صرف منزل عشق کا رہبر ہے بلکہ خود پیغمبر' خود قبلہ اور خود خدا ہے میر کے اشعار میں دل کی کیفیتیں ملاحظہ فرمائیے۔

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل
چشم بصیرت واہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

دل نے تم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

Scanned by CamScanner

گھر دل کا بہت چھوٹا پر جائے تعجب ہے
عالم کو تمام اس میں کس طرح ہے گنجائی

دل عجب نسخہ تصوف ہے
ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
سارے عالم میں میں دکھا لایا

دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا !!

طریق عشق میں ہے رہنما دل
پیغمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

جی چاہئے مل کسوے یا سب سے تو جدارہ
پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ

عمر انساں راہ تو ہے تشویش سے طے ہوتی ہے ولے
دل کے تئیں پہنچے جو کوئی چین کی پھر منزل ہے دل

قلب یعنی کہ دل عجیب زر ہے

Scanned by CamScanner

اس کے تقاوی کو نظر ہے شرط

دل کے ساتھ یہ انجمن آرائی میر کی تنہائی' اداسی اور اجنبیت و مغائرت کے احساس کی بدولت ہے جب مکالمہ کرنے کو کوئی محرم میسر نہ آئے جب ماحول سنسان اور گلیاں سونی ہوں جب بند کمرے کی سی کیفیت طاری ہو جب پورا عہد محبت اور مروت کے جذبوں سے خالی دکھائی دیتا ہو تو پھر خود کلامی کو جی چاہتا ہے دل کے ساتھ مکالمہ غنیمت نظر آنے لگتا ہے پھر اپنی گمشدگی کا احساس ابھرتا ہے اور اپنی تلاش کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

گیا تھا اس کی گلی میں سو پھر نہ پلٹا میر

میں میر میر کر اس کو بہت پکار آیا

اپنے ساتھ مکالمے کا یہ تصور اس وقت ابھرتا ہے جب سناٹے کو توڑ دینے کی خواہش ابھرتی ہے۔ احساس تنہائی کو مارنے اور اجنبیت ومغائرت کے اثرات زائل کرنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے میر کو اپنے ساتھ مکالمہ کرنے کا بہت شوق ہے اس لئے کہ اپنی ذات کچھ کم اہم نہیں ہے اور میر کے یہاں تو ذات کا حوالہ پھیل کر خدا کا حوالہ بن جاتا ہے ان کے نزدیک اپنے تئیں پہنچنا خدا تک پہنچنا ہے اور جب تک خود کو نہیں پہنچے تھے تو محبت سے دوری قائم تھی۔

پہنچا میں آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں

معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

میر تو اپنے سوا کسی کو موجود نہ جانتے تھے بلکہ خود کو اپنا مقصود جانتے تھے۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں

اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

ان کا سارا عجز و نیاز خود اپنی ہی طرف تھا اس لئے کہ مشت خاک ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مسجود سمجھتے تھے یہی نہیں اہل نظر کے نزدیک بھی خود معبود تھے۔

Scanned by CamScanner

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا
اس مشت خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی
اہل نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں!!

گویا میر اس مقام اتصال تک پہنچ چکے تھے جہاں عبد اور معبود ایک ہو جاتے ہیں تاکہ دوئی کا تصور مٹ جائے تو من شدم من توشدی والا معاملہ درپیش ہوتا ہے دراصل آدم کی نمود یا جلوہ گری کا مقصد اپنی ہی سیر تھا لیکن اس رمز کو میر نکتہ داں جیسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

اپنی ہی سیر کرنے کو ہم جلوہ گر ہوئے
اس رمز کو لیکن معدود جانتے ہیں

اس لئے جلوہ گری کے بعد اپنے آپ سے غافل نہیں رہا جا سکتا اور جو خود سے غافل گزر گئے وہ گویا یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے قالب میں تو موجود تھا۔

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

چنانچہ میر کے نزدیک اگر بظاہر بے نشان ذات کا سراغ پانا ہے تو اس کے لئے اپنا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔

میر نے اس نشان کو پایا جان
کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

دراصل یہ جذبہ آرزو ہے جو انسان کو خدا سے بندہ کر دیتا ہے وگرنہ انسان کا دل بے مدعا ہوتا تو شاید وہ بھی خدا ہوتا اور یہ آرزو بھی تو اسی ذات بے ہمتا کی ہے۔ یہی خواہش کا موجب بنتی ہے اور شاید یہیں سے طالب اور مطلوب میں دوری کا احساس ابھرتا ہے اور مطلوب بیگانگی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے تاکہ خواہش اور آرزو کو بڑھا سکے ورنہ دونوں ایک ہی جہاں کے ہیں۔

Scanned by CamScanner

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گردل بے مدعا ہوتا

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی نے مارا تری آرزو نے

میں میر کا اس لئے بھی معترف ہوں کہ میر کی گفتگو ہمیشہ عوام سے رہی۔ انہوں نے عزت نفس کے ساتھ زندگی گزاری۔ نہ کسی سے وظیفہ قبول کیا نہ کسی دولت مند کے آگے دست طمع دراز کیا۔ نہ کسی کی خوشامد سے اپنی زبان اور قلم کو آلودہ کیا نہ تو نوابوں اور امیروں کی چوکھٹ پر اپنا سر جھکایا۔ نہ اپنے کلام کو داد ودہش کے آگے نادم ہونے دیا۔ نہ کبھی بندگی کی خواہش کی اور نہ کبھی خدا بننا گوارا کیا۔ میر خستہ وخراب رہے تمام عمر ناکامیوں سے کام لیتے اور نامرادانہ زیست کرتے عمر بتی لیکن محبت میں نبھانے کا سلیقہ اور وضع داری کا طریقہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

میں جب شکستوں سے چور اور شمع امید کی کرنوں سے دور ہونے لگتا ہوں تو میر مجھے حوصلہ مندی سے زندگی گزارنے کا چلن بتا کر مجھ پر زندگی کے امکانات منکشف کر دیتے ہیں اور یہی کشف اور عرفان مجھے اپنے مرحوم استاد ڈاکٹر سید عبداللہ کی طرح میر کا معترف بنا دیتا ہے۔

Scanned by CamScanner

غالب اور اقبال کا تقابلی مطالعہ

دو شاعروں کا تقابلی مطالعہ اور موازنہ ' جبکہ دونوں کے درمیان زمانی بعد بھی موجود ہو' نہ صرف مشکل ہے بلکہ گمراہ کن نتائج کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ یوں زندگی اور فن کے بارے میں ہر فرد کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ پھر تخلیقی تجربے کی نوعیت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ ایک فن کار کا تجربہ کسی ایک تخلیقی لمحے کی پیداوار ہوتا ہے تو دوسرے فن کار کا تجربہ کسی دوسرے لمحے کا۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ ہم عصر شعراء کا تقابلی مطالعہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک ہی دور میں زندگی بسر کرنے کے باوجود ہر ایک کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ میر' سودا اور درد کا عہد اس کی بہترین مثال ہے۔ تینوں ایک ہی دور سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تینوں کا نہ صرف زندگی کے بارے میں نقطہ نظر مختلف ہے بلکہ فنی رویے بھی الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے اس وقت جب غالب اور اقبال کا تقابلی مطالعہ میرے پیش نظر ہے تو مجھے اس مشکل کا شدت سے احساس ہے کہ صحیح نتائج کا استخراج ہو بھی سکے گا یا نہیں۔

(۲)

مجھے اس موازنے کا شوق اس لئے چرایا کہ زمانہ طالب علمی سے مر

Scanned by CamScanner

عبدالقادر کی وہ رائے میرے سامنے تھی جو بانگ درا کے دیباچے میں درج ہے اور جس میں انہوں نے غالب اور اقبال کو مشترک رنگ کے شاعر قرار دیا ہے۔ اس رائے کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سب کو وہ معلوم ہے۔ یہ رائے وقتاً فوقتاً میرے افق ذہن پر ابھر کر مجھے تحریک دیتی رہتی تھی کہ کبھی اس کا تجزیہ کرنا چاہئے لیکن میرے شوق کو مہمیز اس وقت ملی جب میں نے ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" کا مطالعہ کیا ان کی یہ رائے عبدالقادر کی رائے سے ملتی جلتی ہے کہ۔

"غالب اور اقبال کے خیالات اور فنی محرکات میں بڑی حد تک مماثلت ملتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہنا درست ہو گا کہ اقبال غالب ہی کے سلسلے کا شاعر ہے اس نے اپنے اظہار خیال کے لئے غالب ہی کے پیرائیہ بیان کی پیروی کی جس میں تخلیقی توانائی بھی ہے اور ندرت بھی"

ان آراء کے بارے میں کوئی حتمی بات اس وقت کی جا سکتی ہے جب ہم دونوں عظیم شاعروں کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا تقابلی مطالعہ مکمل کر لیں۔

(۳)

جیسا کہ میں نے ابھی کہا غالب اور اقبال کے درمیان زمانی بعد موجود ہے غالب کی وفات (۱۸۶۹) اور اقبال کی پیدائش (۱۸۷۸ء) کے درمیان کوئی زیادہ بعد نہیں ہے۔ لیکن غالب کے ترک سخن اور اقبال کے آغاز سخن کے درمیان کم و بیش پینتیس چالیس سال کا عرصہ حائل ہے غالب کے زمانے میں انگریزی راج کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا اور مغربی تہذیب کے دھندلے سے نقوش برصغیر پاک و ہند کے افق پر ہویدا ہو رہے تھے۔ غالب نے بنارس لکھنؤ اور کلکتہ وغیرہ کے سفر اور قیام کے دوران میں اس تہذیب کی جلوہ سامانیوں کی جھلک دیکھی تھی اور سرسید کی طرح ان کی نگاہیں بھی اس چکا چوند سے خیرہ ہوئی تھیں۔ پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں۔

"غالب نے وہاں (کلکتہ میں) جو چہل پہل دیکھی جو عمارتیں دیکھیں جو حسین و جمیل عورتیں دیکھیں جو ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا اس نے ان کا دل موہ لیا۔ بنارس میں مناظر فطرت اور حسن انسانی نے ان کے جوان حسن پرست دل پر گہرا اثر ڈالا تھا کلکتہ نے تو تیر نیم کش بن کر وہ خلش پیدا کر دی کہ بعد میں بھی کلکتہ کا ذکر آتا تھا تو انہیں وہاں کے سبزہ زار ہائے معطر اور نازنیں بتاں خود آرا یاد آتے اور سینے میں تیر لگتا۔ کلکتہ میں کچھ ایسی کشش تھی کہ احباب کی دوری کا غم بھی مٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔" (۱)

غالب --- سرسید اور ان کے رفقاء کی طرح مغل سلطنت اور تہذیب کے زوال اور بکھراؤ کو ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے اور اب وہ انگریزی راج کے ساتھ نہ صرف مصالحت کے لئے تیار تھے بلکہ اس کو بہ نظر تحسین بھی دیکھ رہے تھے۔ جب سرسید احمد خان نے آئین اکبری کی تصحیح کے بعد غالب سے تقریظ لکھوانا چاہی تو غالب نے آئین اکبری کے مقابلے میں نئے دور کی سائنسی ایجادات اور برکتوں کو زیادہ اہمیت دی۔ انگریزوں کے شیوہ و انداز اور آئین کی بے حد تعریف کی۔ فرمایا

گر ز آئیں می رود با ما سخن　　چشم بکشا و ندریں دیر کہن
صاحبان انگلستان را نگر　　شیوہ و انداز ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہاپدید آوردہ اند　　آنچہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند
زیں ہنر منداں ہنر بیشی گرفت　　سعی بر پیشیاں پیشی گرفت
حق ایں قومست آئیں داشتن　　کس نیارو ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند　　ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

اس کے بعد مثنوی میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب نئی زندگی کی برکتوں سے متمتع ہونے کا موقعہ حاصل ہے تو پھر آئین اکبری کے خرمن سے خوشہ چینی کی ضرورت ہی کیا ہے (۲) --- اس لئے غالب اپنے شعری رویوں کے اعتبار سے

زندگی کے عجائبات اور تاثرات کی عکاسی تک محدود رہے --- وہ خالصتاً ایک شاعر ہی رہے --- از اول تا آخر --- وہ نہ تو مصلح بنے۔ نہ کسی مقصد اور مشن کے مبلغ --- بلکہ وہ محض انسانی زندگی کے نشیب و فراز کے تحت ابھرنے والے تاثرات اور تبدیلیوں کے ترجمان رہے اور مختلف جذبوں کو زبان دینے کے لئے جگر خون کرتے رہے۔ ان کے سامنے نہ تو کوئی واضح نصب العین تھا نہ کسی اصلاح یا انقلاب کا جذبہ --- پروفیسر احتشام حسین نے درست لکھا ہے کہ۔

"غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ترقی کی علامتوں اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرہ تخیل میں جگہ دی۔ ان سے یہ مطالبہ کرنا فضول ہو گا کہ انہوں نے بادشاہت کی کھلم کھلا مخالفت کیوں نہیں کی جاگیرداری نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ محنت کش طبقے کی رہنمائی کے لئے کچھ کیوں نہ لکھا۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ انہوں نے بدلتے ہوئے زمانے کو کس نظر سے دیکھا۔ اس وقت کتنے شاعر تھے جو اسٹیم انجن، ٹیلی فون، ریلوے اور بجلی کا نام بھی جانتے تھے ان چیزوں کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہی بڑی چیز ہے" (۳)

اس لئے غالب کی شاعری کا تناظر بالکل مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے جبکہ اقبال کے زمانے میں آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ انگریزی راج قریب الاختتام تھا اور اقبال کو اس کا احساس بھی ہو چکا تھا (۴) مغربی تہذیب کی کوتاہیاں، سرمایہ داری نظام کی خرابیاں ظاہر ہو چکی تھیں۔ غالب نے اس کی ظاہری چمک دمک ضرور دیکھی تھی لیکن وہ اس نظام کے استحصالی ہتھکنڈوں اور تاخت و تاراج سے نابلد تھے جبکہ اقبال نے یورپ میں رہ کر قریب سے اس نظام اور تہذیب کا مشاہدہ کیا تھا۔ اگرچہ مشاہدہ تو سرسید نے بھی انگلستان میں رہ کر کیا تھا لیکن وہ اس تہذیب کو تنقید کی نظر سے نہیں تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اقبال اس کے برعکس اس تہذیب کے زبردست نقاد نظر آتے ہیں۔ دراصل ان کی نگاہ دور رس نے اس نظام کے پس پردہ ظالمانہ استحصال اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کو دیکھ لیا تھا اس لئے

Scanned by CamScanner

وہ غالب کے برعکس اس تہذیب اور نظام اقتصادیات کی مادہ پرست ذہنیت سے نالاں تھے اور کھلم کھلا تنقید کر رہے تھے۔

نہ افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

"خدا کے حضور میں" --- سے یہ اشعار ان کے موقف کی تشریح کرتے ہیں۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرشام
یا غازہ ہے یا ساغر ومینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

پھر اقبال غالب کے برعکس ایک مقصدی ادیب تھے۔ وہ اسلام کا احیاء چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی آزادی کے خواہاں تھے۔ ان کو ابتلا اور مصائب سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کے دور میں مسلمانان عالم پر زوال کی جو کیفیت طاری تھی انہیں اس کا قلق تھا اور وہ انہیں خواب غفلت سے بیداری کی طرف لانا چاہتے تھے۔ غالب نے ماضی پر، رنگا رنگ بزم آرائیوں کے برہم ہونے پر ایک مخصوص تہذیب کے بکھراؤ پر اظہار افسوس ضرور کیا۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئیں

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

وہ فراق اور وصال کہاں
وہ شب وروز و ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبار شوق کسے

Scanned by CamScanner

ذوق نظارہ جمال کہاں

لیکن یہ افسوس بھی ذاتی محرومیوں کی بدولت پیدا ہوا تھا ورنہ ان کے سامنے اجتماعی سطح پر تہذیبی احیاء کا کوئی تصور یا پروگرام موجود نہیں تھا۔ نہ انہیں کسی ایسے انقلاب کی خواہش تھی جو نئے سامراجی نظام کا خاتمہ کر سکے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب مغلیہ اقتدار کے زوال کے مقابلے میں انگریزی حکومت کے عروج اور اس کی برکتوں کو حیرت اور مسرت سے دیکھ رہے تھے۔ سائنسی ترقی اور اس کے انکشافات ان کی تشکیک کو تیقن میں تبدیل کر رہے تھے۔ ایل آر گوردن پولنسکایا کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ۔

".... غالب کے قریبی احباب کے ذہن میں یہ بات گھر کرنے لگی تھی کہ بورژوا سماجی ادارے ترجیح کے لائق ہیں۔ غالب خود بھی ان نئے خیالات اور رجحانات سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی کسی سیاسی گروہ بندی میں براہ راست شرکت نہیں کی کیونکہ وہ محض ایک شاعر تھے۔ سیاسی مفکر یا فلسفی نہیں تھے(۵)

لیکن اس کے برعکس علامہ اقبال اجتماعی سطح پر احیائے اسلام کے تمنائی اور ایک ایسے انقلاب کے داعی تھے جو مروجہ نظام سیاست و معیشت کو ختم کر کے ایک نئے نظام حیات کو نافذ کر دے۔ اقبال باقاعدہ ایک سیاسی مفکر بھی تھے اور فلسفی بھی۔

(۴)

غالب کا کوئی اجتماعی فلسفہ حیات تھا اور نہ فرد کی اصلاح کا کوئی جذبہ موجود تھا۔ ان کے یہاں اگر کوئی فرد تھا تو وہ ان کی اپنی ذات تھی جس کا آشوب ان کی شاعری کا مرکزی موضوع بنا۔ یہ فرد اس دور میں قدیم وجدید کی آویزش، نئی اور پرانی اقدار کی کشمکش اور ایک سیاسی ومعاشرتی کرائسس کے درمیان حوصلہ مندی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارتا نظر آرہا ہے۔ غالب کا یہ فرد (جو ان کی اپنی ذات ہے)

Scanned by CamScanner

انانیت کا اظہار بھی کرتا ہے اور مجبوری و بے بسی کا بھی۔ وہ کبھی تو کعبے سے بھی لوٹ آتا ہے۔ اگر اس کا در وا نہیں ہوتا۔ اس کی غیرت مندی کا یہ عالم ہے کہ اپنے محبوب کو خدا کو سونپنے کو تیار نہیں ہوتا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

لیکن کبھی اس کی یہ انا گڑگڑا گڑگڑا کر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی نظر آتی ہے (۶) گویا غالب کے فرد کی کوئی فلسفیانہ بنیاد نہیں ہے۔ وہ ایک جاگیرداری معاشرے کا فرد ہے جو مصلحت اندیش' مراعات یافتہ اور وقت کے ساتھ ساتھ ضرورت کے مطابق بدلنے والا انسان ہے۔ وہ مختلف حالات میں مختلف رویوں کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ان جاگیردارانہ نظام اقدار کا پابند اور پیروکار ہے جو تضاد کا شکار تھیں۔ کیونکہ جو نظام زوال کی زد میں ہو اس میں تضادات کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔ بابا جان غفور رؤف اپنے مضمون "غالب --- ایک مطالعہ" میں لکھتے ہیں۔

"غالب نے جاگیرداری سے سرمایہ داری کے عبور کے پیچیدہ دور میں زندگی بسر کی۔ ایک ایسے دور میں جو ہندوستانی سماج کے ارتقاء کے متضاد عمل کا' پرانے خیالات کے زوال اور جدید خیالات کی کرب انگیز تلاش و جستجو کا آئینہ دار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور ان کے تصور کائنات میں بھی اس عہد کے تضادات کا عکس ملتا ہے (۷)

غالب تضادات کے اس دور میں خود بھی متضاد کیفیتوں کا شکار تھے ان کی شاعری میں آنسوؤں اور آہوؤں کی نمی بھی تھی اور لطف وانبساط کے حصول کی حسرت بھی۔ کیونکہ ای چیلی شیف کے الفاظ میں۔

"غالب نے جس دور میں زندگی گزاری وہ ہندوستان کی تاریخ کا مشکل دور تھا۔ انتہائی گہرے تضادات اور نمایاں ٹکراؤ کا دور تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ایک

Scanned by CamScanner

سماج مرا تھا اور دوسرا جنم لے رہا تھا۔ جب پرانا کلچر منتشر ہو رہا تھا اور ایک نئے کلچر کی بساط بچھائی جا رہی تھی اور تخلیق اور تخریب کی یہی وہ اپج تھی جن میں ان کی شاعری تپ کر کندن بنی۔ ان کی شاعری میں ان تمام قدروں کی تباہی و بربادی پر، جن سے شاعر کا گہرا تعلق تھا، رنج و غم کا احساس، نئی زندگی کے اعزاز میں بلند ہونے والے پرمسرت نغموں اور انسان کی عظمت وحیات ادبی پر غیر متزلزل اعتماد کے ترانوں سے گلے ملتا محسوس ہوتا ہے۔ غالب دو ادوار کے دور وسطی اور دور جدید کے نقطہ اتصال پر کھڑے تھے۔ ایک طرف دم توڑتے کلچر کی آخری ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں اور دوسری طرف نئے کلچر کی ہنگامہ خیز آمد آمد کا شور گرم تھا" (۸)

جبکہ اقبال کا فرد معاشرتی اور تمدنی مقاصد کا تابع، نئے نظام کا داعی اور ایک مخصوص نظام اخلاق کا پابند ہے۔ اس کی زندگی ایک واضح نصب العین کے لئے وقف ہے۔ اس کا ہر عمل ایک طے شدہ پروگرام کے تحت وجود میں آتا ہے اس کی تربیت کے مراحل ہیں۔ اس کی خودی کے استحکام کی شرائط مقرر ہیں۔ ان شرائط کی پابندی اس پر لازم ہے۔ اس فرد کی تعمیر کے بعد اس کی تمام تر صلاحیتیں ایک مخصوص معاشرتی دستور العمل کے لئے وقف ہیں۔ غالب کے یہاں تہذیبی ٹوٹ پھوٹ کا نوحہ بھی ہے تو اپنی ذاتی محرومی کی بدولت ہے کسی عمرانی مقصد کے پیش نظر نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں اسلامی تہذیب کے زوال کا نوحہ عمرانی اور اجتماعی مقاصد کے تابع ہے۔

(۵)

غالب کا کائناتی تصور بھی صوفیاء کے تصور کائنات کے مماثل ہے۔ ان کے نزدیک کائنات کو اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ افلاطون نے اس دنیا کو عالم مثال کا عکس قرار دیا تھا اور خود اس کی مستقل حیثیت کو تسلیم نہیں کیا تھا اقبال نے افلاطون کی مخالفت اس کے اسی تصور کی بنیاد پر کی۔

راہب دیرینہ، افلاطون حکیم

از گروه گوسفندن قدیم
رخش او در ظلمت معقول گم
در کهستان وجود افگنده سم
آنچناں افسون نا محسوس خورد
اعتبار از دست و چشم و گوش برد
گفت سر زندگی در مردن است
شمع را صد جلوه از افسردن است
بر تخیل ہائے ما فرماں رواست
جام او خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباس آدم است
حکم او بر جان صوفی محکم است
عقل خود را بر سر گردوں رساند
عالم اسباب را افسانه خواند
کار او تحلیل اجزائے حیات
قطع شاخ سرو رعنائے حیات
فکر افلاطون زیاں را سود گفت
حکمت او بود را نابود گفت
بسکه از ذوق عمل محروم بود
جان او وارفته معدوم بود
منکر ہنگامه موجود گشت
خالق اعیان نامشهود گشت
قوم ہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوق عمل محروم گشت

حافظ کی مخالفت کا سبب بھی کم و بیش اس کے انہی تصورات کی بنا پر تھا۔ ورنہ اقبال حافظ کو ساحر مانتے ہیں۔ صوفیاء کے عمومی تصورات میں بھی دنیا فانی اور عارضی ہے۔ اسی لئے صوفیانہ مسلک میں مادے کی نفی اور زندگی کے بارے میں سلبی نظریات عام ہوئے۔ نفس کشی، خواہشات کی نفی و تردید، روحانیت کی تکمیل کے لئے سخت ریاضت و عبادت، گیان دھیان کے لئے زندگی کی عملی سرگرمیوں سے گریز --- یہ ساری سلبی کیفیات متصوفانہ فلسفے کی بنیاد بن گئیں۔ غالب نے یہ ساری سلبی کیفیتیں تو قبول نہ کیں لیکن کم از کم دنیا کی حقیقت کے بارے میں فنا کا تصور غالب کا غالب رجحان ضرور بن گیا۔ چنانچہ غالب زندگی کو حلقہ دام خیال سمجھتے ہیں اور اس کے فریب سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہگزار باد یاں

دیوان غالب کا پہلا شعر ہی دنیا کی ہر شے کو بودا اور کاغذی پیراہن کا پیکر قرار دیتا ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام نے اس کا جواز پیش کیا ہے کہ۔

"ان کے یہاں دردمندی ہے جو شعور کی وسعت اور اس کی تہذیب کا پتہ دیتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے محدود ماحول کی شکایت کرتے ہیں اور زندگی کے تجربے کی کمی کے باعث آسانی سے آزردہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اور یہی آرزدگی جب وسیع خارجی ماحول کی اداسی اور ناپختہ لیکن آفاقی انداز فکر سے سیراب ہوتی

Scanned by CamScanner

ہے تو چار و ناچار تصوف کی پناہ لیتے ہیں اور پھر قدرتی طور پر تصوف اپنی قیمت وصول کر لیتا ہے۔ یعنی غالب ' خلوت اور وحشت اختیار کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دنیا کی بے حاصلی سے متاثر ہو کر بے خودی اور فنا کی طرف رجوع کرتے ہیں(۹)

لیکن اقبال دنیا کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا قائم بالذات ہے۔ اور دنیا کے اس نقش کو رنگ ثبات و دوام حاصل ہوتا ہے جس کو کسی مرد خدا نے مکمل کیا ہو کیونکہ مرد خدا کا عمل عشق سے فروغ پاتا ہے اور عشق اصل حیات ہے جس پر موت حرام ہے۔ اس لئے اقبال نے زمان و مکان کی بحث میں زمان خالص کو ابدیت کا حامل قرار دیا ہے۔ مرد مومن زمان و مکان پر متصرف ہو جاتا ہے گویا اقبال کے نزدیک دنیا کا وجود انسانی عمل کا مرہون منت ہے۔ انسانی عمل جاری ہے تو دنیا کبھی ختم نہیں ہو سکتی بلکہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ اقبال زندگی اور دنیا کو غالب اور صوفیاء کے نظریات کے برعکس ٹھوس حقیقت تصور کرتا ہے البتہ اس کے دوام کو عمل کے استمرار سے مشروط کر دیتا ہے۔ لیکن غالب دنیا کو بے ثبات اور بے حقیقت تصور کرتا ہے چنانچہ دنیا اور زندگی کی بے ثباتی کے تصور نے غالب کے یہاں کبھی کبھی مایوسی اور ناامیدی کے مضامین ابھارے۔ اس میں کچھ حصہ ان کی ذاتی زندگی کی محرومیوں اور اجتماعی سطح پر اقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا پیدا کردہ بھی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں مایوسی اور سلبی کیفیت کا اظہار عام طور پر ملتا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی اور نفس انسانی کی بے حقیقی کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ بلاشبہ غالب کے کلام سے زندگی کا مجموعی تاثر امید اور رجائیت کا ابھرتا ہے وہ زندگی کی بوقلمونیوں سے متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ زندگی کے آخری لمحے تک لطف و انبساط کی کیفیات کشید کرنا چاہتے ہیں تاہم ان کے یہاں مایوسی اور ناامیدی کے مضامین بھی کم نہیں۔

منحصر مرنے پر ہو جس کی امید

Scanned by CamScanner

نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں، گورِ غریباں کا

نہ گُل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو، جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

لیکن ان کے برعکس اقبال ایک اجتماعی مشن سامنے رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں مایوسی و ناامیدی کے موضوعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ ہمیشہ زندگی کے بارے میں ایک رجائی نقطہ نظر کی تبلیغ کرتے رہے۔ زندگی کو بے ثبات اور نفس انسانی کو بے حقیقت تصور نہیں کرتے --- بشرطیکہ ان میں عمل کی کار فرمائی موجود ہو۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

Scanned by CamScanner

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم وعرفان ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

Scanned by CamScanner

(۶)

جیسا کہ کہا گیا ہے غالب کے سامنے کوئی اجتماعی فلسفہ تھا' نہ وہ کسی انقلاب کا داعی' اور ہیئت اجتماعی کو انقلاب آشنا کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا تاہم وہ انسانی آزادی کا خواہاں' رسوم وقیود کی پابندیوں کا باغی اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کی حسرت ضرور رکھتا تھا تاکہ شخصی نشوونما میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزم رنگ وبو نمطے دیگر افگنم

غالب کی یہ تمنا دراصل اس جاگیرداری نظام کی سہولتوں اور عیش پرستیوں کی بازیافت کے لئے تھی جو ان کے سامنے زوال کی زد میں آچکی تھیں۔ وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں اس لئے چاہتا تھا کہ لذت خواب سحر کا متلاشی اور رسیا تھا۔ جبکہ اقبال لذت خواب سحر کا نہیں سحر خیزی کا لذت جو تھا۔ وہ ایک نئی دنیا کی تعمیر چاہتا تھا اور معاشرتی اصلاح کا نقیب تھا۔ اس لئے دونوں کے اسالیب بیان میں بھی ایک واضح فرق دکھائی دینے لگتا ہے کہ اقبال وضاحت اور ترسیل مطالب کی شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ انہیں پیغام دوسروں تک پہنچانا ہے۔ غالب کے سامنے ترسیل مطلب کوئی مقصد نہ تھا۔ اس لئے گویم مشکل وگویم مشکل پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ جذبے کا فکر سے انضمام وادغام بھی ہو۔(۱۰)

ڈاکٹر یوسف حسین خان کا خیال ہے کہ "غالب کی فکر جذباتی اور اقبال کا جذبہ مفکرانہ انداز رکھتا ہے"(۱۱)

لیکن میرے خیال میں بات اس کے برعکس ہے یعنی غالب کا جذبہ فکریاتی ہے اور اقبال کی فکر جذباتی ہے۔ اس لئے کہ اگر غالب محض جذبات وتاثرات کا شاعر ہوتا تو پھر میر اور مومن سے آگے نہ ہوتا۔ اور اقبال کی فکر میں جذباتی خلوص

Scanned by CamScanner

اور شدت نہ ہوتی تو اس کی شاعری محض فلسفیانہ موشگافیوں سے آگے نہ بڑھتی۔ غالب نے اپنی جذباتی حسیات کو فکر یاتی رنگ میں سمو کر شاعری کو فلسفہ تو نہیں بنایا لیکن بقول آل احمد سرور "ایک ذہن ضرور عطا کیا"(۱۲)

اسی لئے ان کو باقاعدہ فلسفی کہنا تو صحیح نہیں ہو گا' کیونکہ ان کی فکر کو منطقی دائروں میں اسیر نہیں کیا جا سکتا البتہ وہ اپنے فکری رویوں کی بدولت حکیم فرزانہ ضرور بن گئے۔ ان کے مقابلے میں اقبال نے اپنے افکار کو ایک منطقی تقسیم بندی کے تحت پیش کیا ہے لیکن وہ محض خشک فلسفی بن کر نہ رہ گئے بلکہ انہوں نے اپنی فکر کو جذباتی خلوص کا رنگ دیکر لوگوں کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان "اقبال کا آرٹ دلوں کو لبھانے کے طلسم میں پوشیدہ ہے" (روح اقبال) ورنہ ان کی شاعری کو بطور شاعری کے نہیں منطق و فلسفہ کی تشریحات کا ذخیرہ تصور کر لیا جاتا۔ غالب کی شاعری میں ان کی اپنی ذات (INVOLVE) ہے۔ وہ تاثر کو بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے کومٹڈ ہے لیکن اقبال کی شاعری میں ایک عظیم تر مقصد INVOLVE ہے۔ وہ مقصد اور آدرش سے کومٹڈ ہے۔ جس میں ایک پیغام کی ترسیل شامل ہے۔

(۷)

غالب نہ تو کبھی روحانی ترفع کا دعوی دار رہا ہے اور نہ کسی اخلاقی نصب العین کا پابند۔۔۔۔ وہ بے ریائی اور صاف گوئی سے کام لے کر اپنی خواہشوں کا کھلم کھلا اظہار کرتا ہے اور جب اس کے ارمان نہیں نکلتے تو وہ شکوہ کناں بھی ہوتا ہے۔ اقبال روحانیت کے قائل اور ایک خاص نوع کی مابعد الطبیعاتی فکری نہج کے پیروکار ہیں۔ وہ ایک اخلاقی نصب العین اور عمرانی مقصدیت کے حامل ہیں۔ وہ غالب کی طرح انشراح نفس کے نہیں ضبط نفس کے مبلغ اور قائل ہیں۔

البتہ غالب ہوں یا اقبال دونوں کے یہاں عشق ایک ہنگامہ حیات

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب

عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

اقبال

لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ غالب عشق کو لذت اندوزی، حظ آفرینی اور وصل جوئی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس میں انفرادی تلذذ کا سامان موجود ہے جبکہ اقبال اس کو اجتماعی مقاصد کے حصول کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے عشق کی انتہا وصل طلبی اور طالب و مطلوب کا ادغام ہے اور اس کا جواز ان کے پاس موجود ہے۔

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست وپا کہ یوں

لیکن اقبال کے نزدیک وصل شوق کا زوال ہے۔

عالم سوز وساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

غالب طرب وصل کا آرزو مند ہے خواہ اس کے لئے دامن کو حریفانہ کیوں نہ کھینچنا پڑے۔ لیکن اقبال طلب وصل کے باوجود حوصلہ نظر نہیں رکھتے کہ اس سے آرزو کے مٹنے کا اندیشہ ہے۔ غالب بے باک ہے۔ بے حجابی کا قائل ہے۔

جب کرم رخصت بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

لیکن اقبال کا عشق حیا دار ہے۔ حجاب کا قائل ہے۔

عین وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا

Scanned by CamScanner

گرچہ بہانہ جو ہی میری نگاہ بے ادب
یا
شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال' لذت ساحل حرام

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ غالب کسی بھی نظریے کو منطقی دائرے میں محدود نہیں رکھتے۔ اپنے تخیل کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ جبکہ اقبال اپنے ہر خیال کو نظریہ سازی کے تحت پابند کر لیتے ہیں۔ اس لئے غالب کے یہاں وصال کی کئی سطحیں ہیں۔ کبھی وصل میں دل حریص کے شوق کی فراوانی ہوتی ہے تو کبھی وصال کی واماندگی سے زیادہ حسرت وصل سے لذت اندوز ہونے کی تمنا جاگتی ہے۔

واماندہ ذوق طرب وصل نہیں ہوں
اے حسرت بسیار تمنا کی کمی ہے

کبھی موج کی طرح بار بار ساحل کے وصال کے آرزو مند نظر آتے ہیں اور کبھی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

لیکن اقبال کے عشق میں وصال کی کوئی حالت موجود نہیں ہے۔ کیونکہ وہ وصال سے ترساں ہیں۔ مبادا شوق کو زوال آجائے۔ ان کے نزدیک طلب اور جستجو میں وجود کی بقا اور ابدیت کا راز پوشیدہ ہے۔ پا لینے سے وجود کے معدوم ہونے کا خدشہ ہے۔ اس لئے وہ وصل سے زیادہ ہجر کے تمنائی ہیں۔

ہر لحظہ نیا طور' نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اقبال غالب کے مقابلے میں عشق کے مفہوم کو وسعت دے کر خودی کے ہم معنی قرار دے دیتے ہیں اور خودی ان کے نزدیک اس قدر بے کراں ہے کہ

Scanned by CamScanner

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

یا

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو

البتہ غالب ہوں یا اقبال دونوں عشق کی تخلیقی اور وجدانی تاثیر، اس کی آرزو مندی، شرر باری، دل گدازی، آتش نفسی اور بے تاب بینی کے قائل ہیں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں
ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

ہم نے وحشت کدہ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلہ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

غالب

Scanned by CamScanner

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

بہ باغاں باد فرور دیں دہد عشق
بہ راغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است
بہ ماہی دیدہ رہ بیں دہد عشق

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات

اقبال

(۸)

البتہ اس میں شک نہیں کہ موضوعاتی سطح اور مقاصد کے اہداف سے ہٹ کر اقبال اور غالب کی شعری مہیجات، اسالیب بیان اور مروجہ سانچوں سے انحراف کا طریق کار مشترکہ خصوصیات کے حامل ضرور ہیں۔ دونوں کے اسالیب میں مفرس تراکیب، گھن گرج، عجمی لے اور جوش و خروش موجود ہے۔ دونوں کا سرچشمہ اسلامی تہذیبی اقدار ہیں۔ غالب ایرانی تہذیب سے متاثر ہیں تو اقبال عربی تہذیب سے ہے۔ دونوں تہذیبوں میں احساس برتری اور زبان دانی کا دعوی موجود ہے۔ اس لئے دونوں شاعر اپنے اسلاف کے سرچشموں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ دونوں کے یہاں جذبے کی فروانی، تخیل کی بلندی اور فکری گہرائی موجود ہے۔ دونوں وجدان کے قائل اور وجدان، سرمستی اور کیف میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تہذیبی زوال کا احساس دونوں میں ایک نوحے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے لیکن غالب اس زوال پر افسردہ نظر آنے لگتے ہیں جبکہ اقبال اپنے فلسفیانہ نقطہ

Scanned by CamScanner

نظر اور رجائی فلسفے کی وجہ سے اس زوال کے پس منظر میں ایک نئے زمانے کی بشارت بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ غالب کا رویہ یوں ہے۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے کہ اب تو لذت خواب سحر گئی

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

لیکن اقبال جب ماضی کی یاد میں صدیوں پیچھے جاتے ہیں تو کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتے ہیں۔

آہ وہ مردان حق وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

اقبال کو پوری توقع ہے کہ عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں ایک بار پھر غبار راہ کے پس پردہ نمودار ہو گا۔ وہ اس حقیقت منتظر کو پردۂ مجاز میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ غالب کے یہاں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔

(۹)

غالب اور اقبال دونوں کے یہاں متحرک ابھری ہے سکون اور آرام طلبی کا نام نہیں۔ وسیع المشربی، لبرل نقطہ نظر، رسوم و رواج کے خلاف دونوں کی آواز

Scanned by CamScanner

بلند ہوتی ہے۔ جدت، ندرت، تازگی اور توانائی دونوں کے شعری تناظر میں موجود ہے۔ لیکن غالب کے یہاں یہ انفرادی تجربے کی بدولت ہے۔ غالب کی تخلیقی توانائی محض فن وشعر کی سیرابی کے لئے ہے۔ جبکہ اقبال کا تخلیقی خلوص اور مقصد فن ایک نئی زندگی کی معنویت کی تلاش ہے۔ امکانات کو معلوم کرنا ہے۔

آفریند کائناتی دیگری
قلب را بخشد جہان دیگری

غالب بھی فن وشعر کے لئے دل گداختہ کا قائل ہے۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

لیکن یہ سخن دلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ تو ہے کسی مقصد زندگی کا امانت دار نہیں ہے۔ اقبال کے نزدیک ہنر کا مقصد سوز حیات ابدی ہے۔ شاعر کی نوا ہو یا مغنی کا نفس دونوں کا کام چمن کو افسردہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ترو تازگی، سرسبزی وشادابی عطا کرنا ہے۔ اقبال شاعری یا فن کو مقصود بالذات نہیں سمجھتے بلکہ کسی بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

مری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

بڑی عجیب بات ہے کہ اسلوبیاتی سطح پر غالب متحرک جمالیات کا حامل ہے۔ بے شک وہ زندگی کو فانی تصور کرتا ہے لیکن اس کا تصور حیات بڑا حرکی اور فعال ہے۔ وہ زندگی میں حرکت اور فعالیت کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ اقبال کے حرکی فلسفے کے قریب تر ہیں۔ دونوں کے یہاں زندگی میں حرکت پیدا کرنے کے لئے آرزوؤں اور تمناؤں کا ہجوم ہے۔ دونوں فنی زندگی میں حرکت اور عمل کے قائل رہے۔ حرکت وعمل کا فلسفہ اقبال کے عمرانی نظریات کا ناگزیر حصہ تھا۔ جبکہ غالب سکون آشنا نظام جاگیرداری کے ردعمل کے طور پر حرکت کی تمنا کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

اس جمود و تعطل کے شکار معاشرے میں حرکت و عمل کی پرچھائیں دیکھنا ان کے لئے لذت کا باعث بنتا ہے۔ لیکن یہ شوق عمل کسی اجتماعی ضابطے کا پابند نہیں۔ اقبال عمل کو زندگی کی ابدیت کا ضامن بناتے ہیں۔ غالب کے نزدیک بھی اس دائمی حرکت و عمل کی محرک انسانی تمنا اور آرزو ہے اور اقبال کے نزدیک بھی۔ لیکن دونوں میں فرق مقصد کا ہے۔ غالب کے نزدیک بھی آرزو کی کوئی منزل نہیں ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں
(واماندگی دراصل دم لے کر آگے بڑھنے کا نام ہے)

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجہ رفتار ہے نقش قدم میرا

Scanned by CamScanner

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی حرکت کی خواہش کم نہیں ہوتی

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

گلیوں میں مری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادہ ہوائے سر رہ گزار تھا

دشت امکاں، نیرنگ تمنا، طول سفر شوق، صدائے جرس، جادۂ دشت، بیاباں نوردی، رخت جنون سیل، رہ وادی خیال، گرد بادرہ، کشاکش ہائے ہستی، ذوق دشت نوردی، سیلاب بلا، موج مضطر، گرد رہ جولان صبا --- یہ ساری تمثالیں حرکت، وسعت، اضطراب، سفر کے حوالوں سے پر ہیں۔ ان میں جمود اور سکون کا نام نہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام کے الفاظ ہیں۔

"وسعت اور اس کا احساس جتنا اور جس پیمانے پر غالب کے یہاں ہے اتنا شاید ہی کسی دوسرے غزل گو کے یہاں نظر آئے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ غالب ہی نے سب سے زیادہ تنگی کائنات کا بھی گلہ کیا ہے۔ وہ شوق پر دل کی وسعتوں، جنون پر دشت کی پہنائیوں اور معنی پر الفاظ کے سانچوں کو تنگ پاتے ہیں۔ وہ حرکت چاہتے ہیں اور ان کے شوق کی انتہاء نہیں۔ وہ دریا کا سا جوش رکھتے ہیں اور اپنی رفتار کے آگے بیابان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ اپنی تمناؤں کی پرورش کرتے اور ایک آوارہ عورت کی سی شدت جذبہ کے ساتھ ان کا تعاقب کرتے ہیں (۱۳)

اقبال کے یہاں بھی حرکت و عمل کی علامتیں اور استعارے انسانی وجود کی بقاء کے حوالے سے استعمال ہوئی ہیں۔ فلسفہ اقبال کی بنیاد مسلسل عمل اور دائمی حرکت پر ہے۔ اقبال کے نزدیک وجود کی بقاء سعی و عمل کی مرہون منت ہے اور

اس کی پیمائش کا پیمانہ بھی یہی حرکت دائمی ہے۔

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات
تیری میزان ہے شمار سحر و شام ابھی

یہاں تک کہ اقبال اس جنت کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے جس میں حرکت و عمل کے محرکات ناپید ہوں۔

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غم گسارے

مزی اندر جہان کور ذوقی
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

جنت ملا مے و حور و غلام
جنت آزادگان سیر دوام

جنت کا سکون، آرام اور تکمیل آرزو مندی غالب کو بھی راس نہیں آتی

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اقبال بھی انسانی زندگی کا ارتقاء، سعی پیہم اور جہد مسلسل میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ہمیشہ سفر میں رہتی ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش اس کی وجہ حیات ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں۔

Scanned by CamScanner

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے

ز شرر ستارہ جوئم ز ستارہ آفتابے
سر منزل نہ دارم کہ میرم از قرارے

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ غالب کا سفر حرکت، بے سکونی، ان کے ذاتی اضطراب اور شخصیت کے عرفان کی بدولت ہے۔ یہ جنون عشق کی بدولت ہوا ذوق بیابان نوردی کے سبب بہرحال اس سفریا عمل میں کوئی اجتماعی مقصد نہیں ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں زندگی کی فطرت میں گریزپائی، تڑپ، اضطراب، ذوق پرواز اور سفر موجود ہے۔

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کارواں وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

Scanned by CamScanner

سفر اس کا آغاز و انجام ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

من از ذوق سفر آں گونہ مستم
کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

نہ دیا نشان منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشین نہ راہی

بہرحال تھوڑے سے فرق کے باوجود دونوں جفا طلبی اور سخت کوشی کی طرف مائل ہیں۔ سکون و راحت کی تلاش دونوں کو نہیں ہے۔ اسی لئے دونوں کے یہاں تمثال آفرینی کا نظام بڑا حرکی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بقول۔

"اقبال نے ذات واجب' فطرت اور انسان کے تعلق کا جو تصور پیش کیا ہے وہ حرکت و عمل پر مبنی ہے۔ اس نے اپنی فکر میں انہی تصورات کی ترجمانی کی ہے اس لئے اس پر تعجب نہیں کہ وہ مقصدیت کی خاطر متحرک معانی کا علمبردار ہے۔ ہاں اس پر ضرور تعجب ہے کہ غالب' جس کے پیش نظر کوئی واضح مقصد' علمی مقدمات نہیں تھے۔ اپنی شاعری میں اس قدر متحرک ہے۔ اقبال کے حرکی تصورات اس کے ذہن کی تخلیق ہیں اور غالب کا متحرک نقطہ نظر اس کی فطرت کا اقتضاء ہے۔ دونوں کی متحرک جمالیات میں ان کے یہ رویے نمایاں ہیں۔ دونوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ آزادی اور حرکت کے اصول کے بغیر انسان کی روح اور مادی زندگی کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ (۱۴)

(۱۰)

اس گفتگو کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ غالب اور اقبال کا سیاسی سماجی تناظر، زندگی کے مقاصد کے اہداف، موضوعات کا انتخاب، جذبات و تاثرات کے آفاق مختلف اور متبائن ہیں باوجودیکہ بعض باتوں میں دونوں کا رویہ ایک سا ہے۔ لیکن دونوں کے مقاصد حیات اور مقاصد فن میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے موضوع شعر کے اعتبار سے دونوں میں بعد موجود ہے۔ اور میں سر عبدالقادر اور ڈاکٹر یوسف حسین خان سے اتفاق نہیں کرتا۔ البتہ شعری رویوں اور اسلوبیاتی سطح کے لحاظ سے غالب اور اقبال کے کلام کی قدر مشترک سے مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ اور اس لحاظ سے میں دونوں علماء کی آراء سے متفق ہوں۔ اور اسی لئے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی اس صائب رائے پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ

"غالب اور اقبال دونوں کے کلام کی قدر مشترک جذبے کی شدت، تخیل و فکر کی بلندی اور وجدانی کیف ہے۔ ان سب عناصر کے امتزاج سے ان کا اسلوب بیان وجود میں آیا۔ یہ ان کے کلام کی محض آرائش کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ ان کی فنی تخلیق کا جزو لاینفک ہے۔ (۱۵)

حوالہ جات

۱۔ سید احتشام حسین ---- "غالب کا تفکر" مطبوعہ احوال و نقد غالب مرتبہ محمد حیات سیال، نذر سنز، نقش اول جنوری ۱۹۶۷ء ص ۱۷۲

۲۔ "احوال نقد غالب" ص ۱۷۳ تا ۱۷۵ ملاحظہ فرمایئے

۳۔ ایضا" ------- ص ۱۷۴

۴۔ اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں

Scanned by CamScanner

میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلو فری' رنگ بدلتا ہے کیا

۵۔ "غالب کا فلسفہ حیات" مطبوعہ نگار کراچی ستمبر۱۹۸۶ شمارہ نمبرا

۶۔ یہ اقتباس دیکھئے

"سید صاحب قبلہ ! کیوں تکلف کرتے ہیں؟ اگر یہی مرضی ہے تو تکلف محض ہے۔ فقیر بے سوال ہوں۔ اگر کچھ بھیج دیں گے رد نہ کروں گا۔ کم و بیش پر نظر نہ کریں جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں" (خطوط غالب ص ۴۳۰)

یا

"....... جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے تو میں سکہ لمبر سہی ورنہ خیرات خوار سہی (خطوط غالب ص ۲۰۸)

۷۔ بحوالہ رسالہ نگار کراچی ص ۵۸ ستمبر۱۹۸۶ء شمارہ ۹

۸۔ بحوالہ ----ایضا"-----

۹۔ "غالب ---- تقلید و اجتہاد" ص ۲۲۱-- ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ اشاعت سوم ۱۹۷۹ء

۱۰۔ آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

۱۱۔ "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" ص ۳۲

۱۲۔ "غالب کی عظمت" احوال و نقد غالب' ص ۱۵۰

۱۳۔ "غالب ---- تقلید و اجتہاد" ص ۱۵۱

۱۴۔ "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" ص ۲۰۱-۲۰۲

۱۵۔

غالب کا فن
سیاسی اور سماجی تناظر میں

غالب نے جس دور میں آنکھ کھولی اس کو سماج کی تاریخی تقسیم کے اعتبار سے "جاگیردارانہ سماج" کہنا غلط نہ ہو گا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے برصغیر پاک وہند میں یہ جاگیرداری سماج مغلیہ دربار کے سائے میں نشو ونما پاتا رہا اور ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی سامراج نے اس کی سرپرستی کی۔ مغلیہ دربار سے وابستہ جاگیردار مغل حکمرانوں کے خیر خواہ تھے اور انگریزوں کے پروردہ جاگیردار برطانوی حکومت کے کاسہ لیس تھے۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ ایک ایسا عبوری دور ہے جب مغلیہ جاگیرداری سماج زوال پذیر تھا اور انگریزی راج کے جاگیردارانہ سماج کی تشکیل ہو رہی تھی۔ دو سماجوں کی تخریب وتعمیر کی اس کشاکش میں قدیم وجدید کی آویزش بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔ غالب قدیم جاگیرداری سماج کی پیداوار تھے اور ان کی سیرت کی تشکیل وتعمیر اسی نظام کے تحت ہوئی۔ غالب کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں غیر منقسم ہندوستان میں وارد ہوئے اور بیاسو کا ایک پرگنہ بادشاہ سے حاصل کیا۔ شاہ عالم کے بعد ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ لکھنؤ اور حیدر

آباد میں کچھ عرصہ ملازمت کے بعد آخر کار الور میں راجہ بختاور سنگھ کے پاس ملازم ہوئے اور وہیں لڑائی میں مارے گئے۔ ان کے مرنے پر دو گاؤں سیر حاصل اور کچھ روزینہ مرزا غالب اور ان کے بھائی مرزا یوسف خان کی پرورش کے لئے مقرر کر دیا جو کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ والد کی وفات کے بعد غالب اپنے چچا نصراللہ بیگ خان کی سرپرستی میں آگئے۔ نصراللہ بیگ خان مقامی حکمرانوں کے نہیں انگریزوں کے وفادار فوجی ملازم تھے اور جاگیروں کے مالک تھے۔ چچا کی وفات کے بعد بھی مرزا کو فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے پنشن مقرر ہوئی۔ ۱۸۱۰ء میں ان کی شادی نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خان والی فیروز پور جھرکہ وجاگیردار لوہارو کی بھتیجی امراؤ بیگم کے ساتھ ہوئی۔ ان خاندانی حالات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ غالب "شرفاء" کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو مغل بادشاہوں اور برطانوی حکمرانوں کا پیدا کردہ تھا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ غالب جاگیرداری سماج کی پیداوار اور نمائندہ ہوتے ہوئے بھی ساری عمر اس خوشحال اور مثالی زندگی سے محروم رہے جو اس مراعات یافتہ طبقے (PRIVILEGED CLASS) کا مقدر سمجھی جاتی ہے۔ ایک خط میں اپنی اس کم نصیبی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خان دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط"

(اردوئے معلّٰی ص ۱۴۳)

غالب کے شخصی حالات سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ جاگیروں کی بدولت حاصل ہونے والی عیش ونعمت کی زندگی کو بہت پسند کرتے تھے۔ بلکہ اس کی بحالی اور حصول کے لئے اپنی سی کوشش کرتے رہے۔ کلکتے کا سفر، ملکہ انگلستان کا

قصیدہ، انگریز حاکموں کی مدح اور انگریزی راج کے قیام پر خوشی کا اظہار اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ لیکن اپنی تمام تر کوشش کے باوجود غالب اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے پھر ۱۸۵۷ء کا انقلاب برپا ہوا۔ یہ ایک عبوری دور تھا جس میں پرانا جاگیرداری نظام شکست و ریخت کی زد میں آگیا۔ ایک دوسرے جاگیرداری نظام اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والی نئی اقدار نے جنم لیا۔ غالب نے اپنی آخری زندگی میں سب کچھ دیکھا۔ انہوں نے نئی قدروں کے ساتھ رشتہ استوار کرنا چاہا، زمانے کی ہوا کا رخ پہچانتے ہوئے اس کا ساتھ بھی دینا چاہا۔ لیکن یہ وہ دور ہے جب غالب کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "ہمرہان قافلہ" کا ساتھ نہ دے سکے۔ نہ تو سامراجی قوتوں کی مدح سرائی کام آئی۔ نہ قصیدوں کا صلہ حاصل ہوا۔ اور نہ ہی کلکتے کے سفر کی کلفتیں بار آور ہوئیں، آرزوؤں کی شکست، تمناؤں کی پامالی اور حسرتوں کے اس خون سے غالب کا فن جس طرح رنگین ہوا ہے اس کی تفصیل نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اس لحاظ سے نہایت اہم بھی ہے کہ اس سے فرد اور سماج کے رشتے کی کڑیاں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ غالب مجلسی زندگی کے دلدادہ تھے۔ محفل آرائی ان کا محبوب مشغلہ تھی۔ دراصل غالب زندگی کا بھرپور تصور رکھتے تھے۔ لیکن زندگی سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس دولت ناپید تھی۔ جاگیریں چھن گئی تھیں۔ قدم قدم پر مالی مشکلات کا سامنا تھا۔ بیس آدمی گھر میں کھانے کو موجود، لیکن آمدنی قلیل۔ اس کمی کو خوشگوار ازدواجی زندگی سے پورا کیا جا سکتا تھا۔ لیکن غالب کی گھریلو زندگی بھی سکون سے عاری تھی۔ بیوی سے وہ بیزار تھے۔ بے اولادی کا غم انہیں تھا۔ چنانچہ اس غم کا مداوا شراب اور محفل دوستاں میں ڈھونڈنے لگے۔ مجلسی زندگی سے لگاؤ اس تنہائی کا ردعمل تھی جو غالب کی گھریلو زندگی میں بری طرح چھائی ہوئی تھی۔ وہ بھرے پرے گھر میں بھی اکیلے تھے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ غالب جاگیرداری نظام کے نمائندے تھے اور یہ انجمن آرائی

Scanned by CamScanner

جاگیرداری سماج کی مظہر تھی۔ کبھی یہ مشاعرے کا روپ اختیار کر لیتی تھی تو کبھی نغمہ وے کی محفلوں کی صورت میں نمایاں ہوتی تھی لیکن یہ محفلیں بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ان محفلوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ پرانی قدریں تخریب کا شکار ہونے لگیں۔ نئی قدروں نے جنم لینا شروع کیا۔ غالب اپنے آپ کو حالات کے تیز و تند دھارے کے سامنے بے بس پاتے ہیں۔ اب وہ ماضی کی یادوں کا سہارا تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں کتنی حسرت کا اظہار ہے۔

"وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے، شعر کہے، دیوان جمع کئے .... ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ انبساط ....."

(خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۵۲)

اسی طرح میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا"

(خطوط غالب ص ۴۹۳)

حقیقت یہ ہے کہ غالب کی شخصیت کو حوادث زمانہ نے شکست سے دو چار کیا اور وہ خود اپنی "شکست کی آواز" بن کر رہ گئے۔ زندگی کی تلخ اور ناقابل برداشت حقیقتوں سے بیزار ہو کر غالب ماضی کو ایک "پناہ گاہ" بنا لیتے ہیں۔ "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" والی پوری غزل اسی "پناہ گاہ" کی تلاش ہے۔ غالب حال اور مستقبل سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ اس لئے تو ماضی کی [illegible] رنگ بزم آرائیوں کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ اور کبھی اپنے دل کو اس

ہیں۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے کہ اب تو لذت خواب سحر گئی

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا تقاضہ ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

لیکن جب ماضی کا امرت بھی ان کے غم کے زہر کا تریاق نہیں بنتا تو پھر وہ مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

خزاں کیا، فصل گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہاں ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسماں ہے

کائنات کی بے ثباتی کا خیال، دنیا کا محض "حلقہ دام خیال" دکھائی دینا۔ آفرینش کے تمام اجزاء کا زوال آمادہ نظر آنا اور مہر گردوں کا چراغ رہگزر باد معلوم ہونا، اسی مایوسی کی بدولت ہے۔ دنیا کی رنگینیوں پر جان چھڑکنے والا اور زندگی کا بھرپور تصور رکھنے والا شاعر غالب جب کائنات کی بے ثباتی کا ذکر چھیڑ دیتا ہے تو بظاہر اس کی وجہ تصوف کی وہ روایت نظر آتی ہے جو فارسی غزل کے وسیلے سے اردو شاعری میں داخل ہوئی لیکن اگر ذرا سا غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ غالب کے

یہاں یہ مضمون محض روایتی نہیں بلکہ اس کے پیچھے ٹھوس حقائق اور خارجی عوامل کار فرما نظر آتے ہیں۔ دراصل غالب نے آخر کار اس حصار کو ٹوٹتے ہوئے محسوس کیا جو جاگیردارانہ نظام نے ایک خاص طبقے یعنی "اشرافیہ" کے تحفظ کے لئے قائم کیا تھا۔ غالب اس تحفظ سے لڑکپن ہی سے محروم ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہ اس کے حصول کے لئے تمام عمر مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہ ہو سکے دنیا کی بے حقیقی کا تصور غالب کے یہاں تصوف کی روایت سے زیادہ اسی محرومی اور شکست کے احساس کی پیداوار ہے۔ بڑھاپے اور قویٰ کے اضمحلال نے ان کی مایوسی کو اور شدید کر دیا پھر ماضی کی یادیں، مجلسی زندگی کا خاتمہ، زمانہ شباب کا خواب بن جانا، دربار کی سرپرستی، خطابات اور انعام واکرام سے محرومی کا احساس اور مفلسی کا غم، یہ وہ عوامل ہیں جنہوں نے غالب کی شاعری اور نثر میں مایوسی کا رنگ بھرا۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

زندگی گر اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اب اس ناامیدی اور مایوسی کا اظہار نثر میں ملاحظہ کیجئے۔

"... کچھ بن نہیں آتی --- آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں --- میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کر لیا ہے --- جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی --- بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں ---"

(خطوط غالب ص ۱۱۹)

"کہتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہل سلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین"

(خطوط غالب ص ۱۲۰)

"مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید' نہ رنجور ہوں نہ تندرست' نہ خوش ہوں نہ ناخوش' نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں' باتیں کئے جاتا ہوں' روٹی روزانہ کھاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مروں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے بے سبیل حکایت"

(خطوط غالب

"ہر روز مرگ نو کا مزہ چکھتا ہوں' حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں' پھر کیوں جیتا ہوں' روح میرے جسم میں اب اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں' کوئی شخص' کوئی اختلاط' کوئی جلسہ' کوئی مجمع مجھے پسند نہیں' کتاب سے نفرت' شعر سے نفرت' جسم سے نفرت یہ جو کچھ لکھا ہے بے ضابطہ"

(خطوط غالب

مایوسی اور غم فنکار کی شخصیت کے زیر اثر اس کے فن میں مختلف رجحانات کو جنم دیتے ہیں۔ مثلاً" میر تقی میر' خواجہ میر درد اور سودا ایک ہی زمانے کے شاعر ہیں۔ تینوں کے یہاں غم کی لہر موجود ہے لیکن تینوں کے فن میں ان کے مخصوص رجحانات کے زیر اثر یہ لہر مختلف اثرات پیدا کرتی ہے۔ میر کے ہاں غم کی یہ لہر ایک

Scanned by CamScanner

وسیع اور ذخار سمندر بن جاتی ہے جو ان کی شخصیت اور فن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ خواجہ میر درد کے یہاں یہ لہر جوئے نغمہ خواں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے صوفیانہ مسلک کی شاعری میں صبر و توکل کا عنصر اسی لہر کا پیدا کردہ ہے۔ سودا کے ہاں یہ لہر ایک طوفان بن جاتی ہے۔ اور یہ طوفان شہر آشوب اور ہجویات میں طنز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حکیم فرزانہ غالب کے یہاں غم زیادہ تر جذباتی سوتوں سے پھوٹتا ہے اور فکری پیمانوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اس لحاظ سے غالب اور اقبال میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اقبال کے یہاں بھی غم کی نوعیت بالکل ویسی ہے جیسی غالب کے یہاں۔ میں اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کلام غالب میں غم کے عناصر نے کیا کیا فکری نوعیتیں اختیار کی ہیں۔ میں فی الحال ان کے غم سے ابھرنے والے دو واضح رجحانات کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں ان میں ایک آزار پسندی کا رجحان ہے اور دوسرا "الفت ذات" کا۔

غالب کے یہاں غم کی کیفیت نے آزار پسندی کے رجحان (MASOCHISTIC TENDENCY) کو جنم دیا۔ آزار پسندی کے ذریعے غالب نے اپنی مایوسی کا دفاع بھی کیا ہے۔ یہ کیفیت جیسا کہ سلیم اختر (مرد عاشق کی مثال' غالب (نگاہ اور نقطے) کا خیال ہے ان کی جذباتی اور نفسیاتی الجھنوں کی پیداوار بھی ہو سکتی ہے لیکن میرے خیال میں اس کا رشتہ بھی انہیں خارجی عوامل کے ساتھ جڑا ہوا ہے جن کے تحت غالب اپنے آپ کو محرومیوں اور ناکامیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ ان کی زندگی بچپن سے آخر تک مایوسیوں سے دوچار رہی۔ اس لئے تو انہیں کہنا پڑا کہ

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غالب کو ہمیشہ "وصال یار" ...

تھے لیکن مفلسی اور بدنامی ان کا مقدر ہو گئی تھی۔ انہیں اپنی فنی عظمت اور شاعرانہ برتری کا شدید احساس تھا۔ لیکن بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوق کی قدر و منزلت ان سے کہیں زیادہ تھی۔

یہی وہ خارجی عوامل ہیں جو غالب کی شخصیت اور فن کا جزو بن کر ان کے ہاں آزار پسندی اور رشک کے رجحانات کے محرک بنے ہیں۔ آزار پسندی کے رجحان کی نشاندہی کے لئے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

مقتل میں کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

عشرت قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

زخم پہ چھڑکیں کہاں طفلان بے پرواہ نمک
کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

ہر سنگ وخشت ہے صدف گوہر شکست
نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانہ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

عشرت پارہ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر غرق نمکدان ہونا

Scanned by CamScanner

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

سر کھجاتا ہوں جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذت سنگ باندازہ تقریر نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

غالب نے مایوسی اور غم کے دفاع کے لئے "الفت ذات" کا سہارا بھی تلاش کیا ہے۔ دراصل غالب جب گردوپیش کی دنیا سے مایوس ہو کر خارج سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو اپنی ذات میں پناہ لیتے ہیں۔ جو ان کے لئے حصار کا کام کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی ذات سے بے پناہ الفت کے بعد ہی یہ پناہ تلاش کی جا سکتی ہے۔ غالب کو نہ صرف اپنی ذاتی خوبیوں اور شاعرانہ خصوصیات کا خیال تھا بلکہ وہ خاندانی وجاہت اور نسلی امتیاز کا بھی شدید احساس برتری رکھتے تھے یہ الگ بات ہے کہ اس احساس برتری کی بنیاد احساس کمتری ہوا کرتی ہے کیونکہ جب کسی فرد میں زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی یا وہ مادی زوال کا شکار ہو جاتا ہے تو اپنی انا کو حصار بنا لیتا ہے۔ یا "پدرم سلطان بود" کے تصور سے جی بہلاتا ہے۔ غالب کے یہاں بھی نسلی امتیاز یا خاندانی وجاہت کا احساس اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب ناقدری زمانہ کا خیال ان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ غالب زوال آمادہ نظام میں بھی پرانی قدریں تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہی عروج دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے آباؤ اجداد کو حاصل تھا۔ لیکن سوسائٹی میں وہ مقام حاصل

Scanned by CamScanner

کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو احساس برتری (یا احساس کمتری) کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں۔

"یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ "مرزا" یا "میر" نہیں لکھتے۔ یہ دستور ہے یا "نواب اسد اللہ خان" لکھو یا "مرزا اسد اللہ خان" لکھو اور "بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے"

(خطوط غالب ص ۲۴۶)

اسی طرح ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف (مرزا نوشہ) نہ لکھیں۔ مگر ہاں نام کے بعد لفظ "بہادر" کا اور بہادر کے بعد تخلص اسد اللہ خان بہادر غالب"

(خطوط غالب ص ۱۲۷)

اور یہیں سے غالب کے ذہن اور عمل کا تضاد شروع ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے یعنی ذہنی طور پر وہ احساس برتری کا شکار تھے لیکن عملی زندگی میں وہ سخت احساس کمتری کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً" یہ شعر دیکھئے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئیں گے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور پھر ان کے وہ خطوط پڑھئے جن میں وہ گڑگڑاتے، ہاتھ پھیلاتے اور خوشامدیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذہنی طور پر احساس برتری کے ساتھ احساس کمتری کا یہ عملی مظاہرہ اس تضاد کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ فرہاد پر طنز کے نشتر چلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

یا

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب

Scanned by CamScanner

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اور ادھر

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایک طرف تو وہ بہت خود دار نظر آتے ہیں۔ "خانماں خراب" ہونے کے باوجود کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہتے۔ "گرداب بلا" میں اسیر ہونے کے باوصف "دامن الیاس" تھامنا پسند نہیں کرتے۔ اور ایسے سہارے کا جینا ڈوب مرنے سے بدتر سمجھتے ہیں لیکن دوسری طرف۔

"نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، امید گاہ درویشاں، آپ کا بندہ، منت پذیر، غالب خونیں جگر، یوں نواسج ہوتا ہے کہ عضابت نامہ، غرور ورود لایا اور مژدہ قبول سے میرا مرتبہ بڑھایا۔ جو میرے فن میں ارشاد ہوا اگر اس کو قدر دانی کہوں تو لازم آتا ہے۔ عطیہ حضرت (سو روپے کا عطیہ) بتوسط جناب سیف الحق پہنچا۔ اور میں نے اس کو بے تکلف عطیہ مرتضوی سمجھا، علی مرتضیٰ آپ کا دادا میرا آقا، خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا"

(خطوط غالب ۴۲۲)

"سید صاحب! قبلہ کیوں تکلف کرتے ہیں؟ اگر یہی مرضی ہے تو تکلف محض ہے۔ فقیر بے سوال ہوں۔ اگر کچھ بھیج دیں گے رد نہ کروں گا۔ کم وبیش پر نظر نہ رکھیں۔ جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں"

(خطوط غالب ص ۴۳۰)

"..... جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے تو میں سکہ لبر سہی ورنہ خیرات خوار سہی"

(خطوط غالب ص ۲۰۸)

Scanned by CamScanner

دراصل یہ تضاد بھی ان دو نظاموں کی باہمی آویزش کا نتیجہ ہے۔ غالب اس عبوری دور میں ماضی اور حال کے تھپیڑے کھا رہے تھے۔ ماضی ڈوب چکا تھا۔ حال سے وہ غیر مطمئن تھے اور مستقبل غیر یقینی تھا چنانچہ اس کشمکش میں وہ تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے یہاں یہ تضاد ایک دوسری صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی عملی زندگی سے شکست تسلیم کر لینے کے بعد ذہنی طور پر بغاوت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں عملی طور پر حالات و مصائب کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ نہیں رہتا تو ذہنی بغاوت کا مظاہرہ کر کے اپنی "انا" کو مطمئن کرتے ہیں

بیا کہ قاعدهٔ آسماں بگردانیم
رختم کہ کہنگی بہ تماشا برا فگنم

حالانکہ ان کی عملی زندگی اس کے بالکل برعکس ہے۔ دراصل عملی زندگی میں فنکار جو شکست کھاتا ہے اس کی کو فن کے ذریعے پورا کرتا ہے۔ چنانچہ غالب کے یہاں یہی کیفیت کار فرما نظر آتی ہے۔ غالب کے ہاں اس شکست کا ردعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ دنیا کے ہاتھوں شکست کھا کر ہی غالب اس کو "بازیچہ اطفال" کہتا ہے۔ حالات کے سیل تند و تیز کے آگے بے بس ہوتے ہیں تو ذہنی بغاوت کو حصار بناتے ہیں۔ یہ ذہنی بغاوت بھی ان کی ذات تک محدود ہے کسی اجتماعی بغاوت کی محرک بننے کی اہل نہیں ہے۔ غالب کا اپنے گریبان پر تو بس چلتا تھا "دامن یزداں" کو چھونے کا حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ وہ درباداری اور جاگیرداری نظام کے دام میں اس طرح اسیر تھے کہ حسرت پرواز کے باوجود اس دام کو الٹ نہ سکتے تھے اور نہ ہی صیاد سے آنکھ ملانے کا حوصلہ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ذوق کے ساتھ ایک درباری قضیئے میں بہادر شاہ ظفر کی ذرا سی خفگی کو بھی برداشت نہ کر سکے اور معذرت وانکساری کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال

یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے

دراصل یہ انفعالی کیفیت اور شکست خوردگی اس دور کی پیدا کردہ ہے جو پوری طرح جاگیردارانہ سماج کی گرفت میں تھا۔ غالب کا ایسا درباری نظام کی پیداوار شاعر کسی مادی انقلاب اور اسکے نتیجے میں ابھرنے والی تمدنی اقدار کا محرک بننے کا اہل نہیں تھا۔ ان کے یہاں کئی ایک روایات' مسلمات اور عقائد کے خلاف بغاوت کی آواز بلند ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

انداز جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

طرح نوافگن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناش خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

لیکن یہ روایت شکنی محض بغاوت کا نام پا سکتی ہے کسی مادی انقلاب یا جاگیرداری نظام کے خلاف رہنما بننے کی نیک نامی حاصل نہیں کر سکتی بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ یہ روایت شکنی بھی دراصل ان کی نرگیست اور الفت ذات کی

پیداوار ہے۔ خود بینی اور خود پسندی کا جذبہ غالب کے یہاں بڑا شدید ہے اور اس جذبے کو مندرجہ بالا اشعار میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غرض غالب نے اپنی زندگی کے آخری دور میں قدیم وجدید کی آویزش دیکھی۔ انہوں نے پرانی قدروں کی شکست وریخت کے بعد نئی اقدار کو ابھرتے دیکھا۔ اور صرف تماشا ہی کرتے رہے۔ ان سے رشتہ بھی استوار کرنا چاہا۔ شکست خوردہ ماضی کے غم کو نئے سماج کے تجربات میں محو کرنا چاہا۔ یہ نئے تجربات گویا "طوفان حوادث" تھے جو غالب جیسے "اہل بینش" کے لئے مکتب کا درجہ رکھتے تھے لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ اس دور میں غالب کے قوی مضمحل ہو چکے تھے۔ عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر "جدت پسند" غالب "طرح نو" کی تعمیر کرتے' دل میں "حسرت تعمیر" لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

Scanned by CamScanner

کلام غالب میں تمثال شعری کی بہترین مثال

ظلمت کدے میں میری شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

یہ مطلع غالب کی جس غزل کا ہے اس غزل کا نہایت مشہور قطعہ بند ہے۔

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار گر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان با غبان و کف گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نئے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

Scanned by CamScanner

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غزل کا یہ قطعہ بند غالب کی شاعری کا تکملہ اور ایک مخصوص دور کے تہذیبی عروج وزوال کا ایک ایسا نوحہ ہے جس کی مثال اردو شاعری میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

غالب کی تہذیبی شخصیت اس دور کی پیداوار ہے جب مغل سلطنت کی بساط الٹی جا چکی تھی۔ زوال اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ قدیم وجدید کی آویزش فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ نئی اقدار کے سامنے قدیم اقدار کی شکست ایک حقیقت بن کر ابھر رہی تھی۔ غالب شکست وریخت کے اس پے بہ پے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جاگیرداری نظام اپنی شکست کی آواز بن کر ابھر رہا تھا۔ وہ محفل رامش ورنگ، جو مغل تہذیب کی جھنکار بن کر گونجا کرتی تھی، اب ماند پڑ رہی تھی۔ نغمہ دے اور محمد شاہ رنگیلے کی سرمستیوں کے دن لد گئے تھے۔ ایک نئی تہذیب پرانی تہذیب کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کو تیار تھی۔ محفلیں ویران اور رنگا رنگ بزم آرائیاں طاق نسیاں پر رکھی جا رہی تھی۔ یہ غزل اور غزل کا یہ حصہ ایک خاص دور اور اس دور کی زوال آمادہ اقدار کو پیش کر رہا ہے۔

اشعار کی رسمی اور فرسودہ انداز میں تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ موضوع اور مفہوم بالکل واضح ہے۔ غالب شب غم کے جوش اور ظلمت کدے سے غزل کا آغاز کر کے ایک محفل کے درہم برہم ہونے کا اعلان کر رہے ہیں جس کے جلوے مفقود ہو گئے ہیں۔ اب بزم مے کی بجائے بزم خیال سجائی جاتی ہے۔ ایک نسل جو شکست وریخت کے صدمے سہہ کر اپنی بساط لپیٹ رہی ہے۔ وہ آنے والی نسل کے لئے عبرت کا سامان بن گئی ہے۔ وہ محفلیں جہاں کبھی ساقی اپنے جلوے بکھیر کر ایمان وعقائد کو متزلزل کر دیتا تھا اور مطرب چنگ ورباب سے تمکین وہوش کو لوٹ لیتا تھا۔ ہر گوشہ بساط دامان باغبان اور کف گل فروش دکھائی دیتا تھا۔ ساقی کی

Scanned by CamScanner

چال نگاہ کے لئے جنت اور صدائے چنگ کانوں میں رس گھولتی تھی۔ وہاں اب افسردگی کا دور دورہ ہے۔ وہ بزم اجڑ گئی ہے۔ زندگی کی اقدار تبدیل ہو گئی ہیں۔ اب وہ سرود و سوز اور جوش و خروش باقی نہیں رہا۔ شمع جو رات محفل میں روشنی کا منبع تھی اب محفل کے اجڑنے کے بعد خموش ہو چکی ہے۔

غالب نے چند اشعار کے حوالے سے اپنے تہذیبی کراسس، سیاسی اور سماجی زوال کی داستان بیان کردی ہے۔ ایک دور کا المیہ منظوم کر دیا ہے شمع کے بجھنے کی امیج سے تلازمات کے کتنے سلسلے سامنے آجاتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا بکھراؤ۔ اسلامی تہذیب کا زوال --- اور دور عروج کا خاتمہ --- یہ غزل غالب کے شاعرانہ اور تخلیقی تجربے کی بہترین مثال ہے اور اس کی عظمت کا دارو مدار اس شاعرانہ اظہار پر ہے جو تمثال آفرینی کے ایک عظیم نظام کے تحت وجود میں آیا ہے۔ غالب کے زمانے میں استعاراتی نظام یا تماثیل (IMAGES) کا استعمال بالعموم صنائع شعری اور اسالیب بلاغت کو اجاگر کرنے کی خاطر کیا جاتا تھا۔ لیکن غالب کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے وجدان کے سرچشموں کو تمثالوں کے ذریعے بہایا اور تخیل کو سیراب کیا۔

یہ غزل تمثالوں کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔ ان تمثالوں کے ذریعے تہہ در تہہ سلسلے وجود میں آتے ہیں اور معانی کی نئی جہتیں پیدا ہوتی ہیں غالب نے اس غزل کے حوالے سے متمدن زندگی میں تخلیل کی تازگی اور فطری احساس تحیر کو برقرار رکھاہے۔ ہمارے لئے اس حالت کی جانب مراجعت مشکل نہیں رہتی۔ جس میں ہر تجربہ اور مشاہدہ ایک مکاشفے یا الہام کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ شاعر نے باہر کی دنیا کو اپنی داخلی واردات کے ساتھ ہم آہنگ کر لیاہے افسردگی کی جو فضا محفل کے درہم ہو جانے سے نظر آتی ہے۔ وہ غالب کے اندر کی دنیا کے درہم برہم ہونے کے ساتھ مربوط ہے۔ ایسی ہم آہنگی نے تمثال سازی کے عمل کو اور بھی زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ یہ تمثالیں غالب کے منفرد طرز احساس اور انداز فکر و نظر

Scanned by CamScanner

کا نتیجہ ہیں۔ تازہ واردان بساط ہوائے دل، گوشہ نشاط، دامان باغبان، کف گل فروش، خرام ساقی، صدائے چنگ، بجھی ہوئی شمع، یہ سب تراکیب، تمثال شعری کی فراوانی، تنوع، ایمائیت اور خیال انگیزی کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ جن کی وجہ سے غزل کا خارجی موضوع جو معروضی حالات کے بطن سے پھوٹا ہے۔ شاعر کی داخلی واردات کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔

اس غزل کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں دو جذبے اور دو کیفیتیں بیک وقت متحرک نظر آتی ہیں ایک کیفیت تو خوشی کی محفل کی ہے جس میں جلوہ حسن کا سامان ہے۔ مطرب کا نغمہ ہے۔ نائے ونوش کی ہوس ہے۔ اور دوسری طرف افسردگی، یاسیت اور زوال کی کیفیت ہے۔ غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان متضاد کیفیتوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے دونوں کے تقاضوں کو بیک وقت پورا کیا ہے۔ گویا ایک کیفیت نے دوسری کو شدید (INTENSIFY) کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ غالب ہی کا کام تھا۔

"ہر ہوس ناکی نداند جام وسنداں باختن"

غالب کی عبقریت اور نابغیت (GENIUS) کا سب سے عظیم اور روشن مظہر ان کے تخیل کی وہ صورت گر قوت ہے جو خیال کو پیکر عطا کرتی ہے اور محسوسات کو فکر ووجدان کی بلندیوں سے روشناس کرتی ہے۔ حکیمانہ فکر اور شاعرانہ بصیرت کا مکمل امتزاج ان کی شاعری کا ایک امتیازی وصف ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ غزل ہمارے سامنے ہے۔ اس غزل میں تمثال آفرینی کا جو نظام قائم کیا گیا ہے اس کی امتیازی خصوصیات، وسعت، ہمہ گیری، تازگی، ندرت، وضاحت، تابناکی، حرکت وحرارت، توانائی، پہلو داری اور گہرائی ہیں۔ انہی خصوصیات کی بدولت غالب کی تمثال آفرینی میں گہری معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے اشعار کے بارے میں ان کا یہ دعوی محض شاعرانہ تعلی نہیں ہے بلکہ ایک صاحب شعور فنکار کا اپنے فن پر محاکمہ ہے کہ

Scanned by CamScanner

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

یہ تمام تماثیل حسی، بصری اور سماعی ہیں اور ہر تمثیل ایک تصویر کو سامنے کردیتی ہے جس کو جملہ حواس کی مدد سے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس غزل میں غالب کے تخیل کی کار فرمائی نے ان کی تمثال سازی کے عمل میں دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ تخیلی قوت کبھی کبھی حسی تجربے کی ترفیع (SUBLIMATION) کر کے اس کی حدیں مجرد افکار سے ملا دیتی ہے۔ لیکن محسوس مظاہر حسن سے شدید وابستگی کی بدولت ان تماثیل شعری اور تشبیہات واستعارات میں وہ رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے جو غزل کی شاعری میں شاذو نادر ہی نظر آتا ہے اس بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ حقیقی استعارہ جسے ارسطو نے شعبہ علم قرار دیا ہے غالب کی شاعری میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور یہ غزل استعاراتی نظام اور تماثیل شعری کا بہترین نمونہ ہے۔

Scanned by CamScanner

"غالب ------ عصر حاضر کے آئینے میں"

بڑی شاعری وہ ہے جس میں ہر دور کے انسان کا دل دھڑک رہا ہو اور جس میں ہر عہد کے انسانوں کے ذہنی اور جذباتی رویے موجود ہوں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے معاشرتی رویے اور ساجی ہیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ معروضی حالات ماحول اور وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے اثرات انسان کے بنیادی جذبوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ باتیں بنیادی انسانی نفسیات کا حصہ ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے اندر ایک اپیل رکھتی ہیں۔ محبت' انسانیت' خلوص' مروت' ایثار اور دوستی کے وہ جذبات جو انسانی شرافت کا خاصہ رہے ہیں ہر دور میں پسند کئے جاتے رہے۔ اس کے باوصف کہ ان کی نوعیت مختلف قوموں اور مختلف طبقوں میں مختلف رہی۔

غالب بنیادی انسانی جذبوں کا شاعر ہے۔ اس نے ان جذبوں کو اپنی شاعری کا سرچشمہ بنایا جو ہر عہد کے انسان کو اپیل کرتے ہیں۔ اگرچہ غالب کو اپنے دور میں ناقدر شناسی زمانہ کا شکوہ رہا اور انہیں یہ کہنا پڑا۔

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

تاہم یہ محض اپنے عہد کا شکوہ نہ تھا بلکہ اس امکان کا اظہار بھی تھا کہ ان

Scanned by CamScanner

کے اشعار کی قدر و منزلت کا تعین آئندہ نسلیں کر سکیں گی کہ جن کی سوچ یقیناً وسیع اور نظر زیادہ گہری ہو گی۔ غالب کو نئے زمانے کی وسعت نظری کا احساس تھا۔ وہ ارتقاء کے قائل اور اس حقیقت کے معترف تھے کہ ہر آنے والا لمحہ اپنے سے پہلے لمحے سے جدید تر اور آگے ہوتا ہے دراصل جوانی کے عالم ہی میں انہیں زندگی کے ایسے تجربات حاصل ہوئے جنہوں نے انہیں ایک نئے معاشرتی نظام اور جدید تر دور کی آمد کا احساس دلا دیا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں جبکہ ان کی عمر تیس ۳۰ اکتیس ۳۱ سال سے زیادہ نہ تھی۔ انہیں کلکتہ کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ کلکتہ اس وقت اپنے معاشرتی نظام اور مادی ترقی کے لحاظ سے بہت آگے تھا کیونکہ انگریزوں نے اس شہر کو اپنا مرکز بنا لیا تھا اور وہاں ایک نئی تہذیب کا آغاز ہو چکا تھا۔ بقول انیس ناگی "کلکتہ میں انگریز حکمرانوں کی بدولت زندگی بڑی آزادانہ تھی۔ کلکتہ ایسٹ انڈیا کا مرکز تھا۔ اسی راستے سے مغربی ٹیکنالوجی ہندوستان درآمد کی جا رہی تھی۔ یہ زمانہ انگریزوں کے عروج کا تھا اور فار ایسٹ میں انگریزوں کی مہمات کے لئے رسد کا ایک مرکز کلکتہ تھا۔ غالب کے زمانے میں کلکتہ ایک بین الاقوامی شہر بن چکا تھا جہاں ہگلی میں دخانی جہاز دھواں اگل رہے تھے اور نوآبادیاتی طرز تعمیر کی بڑی بڑی عمارتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ یہ بہت بڑا سیاسی اور تمدنی تھا۔ (ا) لیکن غالب جیسے وسیع النظر اور لبرل انسان نے اس تہذیبی آزادی اور نسبتاً" کھلے معاشرے کو نفرت کی نگاہ سے نہیں تحسین و آفرین کی نظر سے دیکھا۔ اس سفر کی یاد ان کو مدتوں تڑپاتی رہی۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ان کی نگاہیں وہاں کے سبزہ زار ہائے مطرا' میوہ ہائے تازہ و شیریں' بادہ ہائے ناب اور نازنین بتان خود آرا کی چکا چوند سے خیرہ ہوئیں۔ یہ اثرات عارضی نہ تھے بلکہ دائمی ثابت ہوئے چنانچہ ۱۸۴۷ء میں جب سرسید احمد خان نے آئین اکبری کو ایک نئے انداز سے مرتب کیا اور غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش

Scanned by CamScanner

کی تو از راہ مروت تقریظ تو لکھ دی لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ میں

''اپنی منظوم فارسی تقریظ میں سائنس کی بہم پہنچائی ہوئی بعض سہولتوں مثلاً دخانی انجن، ریل گاڑی، تار اور ڈاک کے نظام، جہاز رانی، ماچس کی تیلی، بجلی کی روشنی، گراموفون، چھاپہ خانہ اور کاشتکاری و صنعت کے نئے آلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نئی تہذیب کی آمد کا مژدہ سنایا اور پرانے بادشاہوں کے نظام حکمرانی کی اشاعت و ترویج کو نا مستحسن قرار دیا'' (۲)

گویا انہوں نے زندگی کی نئی قدروں کو قبول کر لیا تھا اور وہ اس حقیقت کا ادراک کر چکے تھے کہ نئے زمانے کی ایجادات اور اکتشافات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کی بجائے ان کو خوش آمدید کہنے اور ان کی اہمیت و افادیت کو قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جب یہ کہا تھا کہ

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

تو یہ محض اپنے اہل کمال ہونے کا دعویٰ نہیں تھا بلکہ آنے والے جدید تر انسان اور اس کے عصری ترقی، سائنسی ایجادات، کائنات کی دریافت اور نت نئے انکشافات کے سامنے پرانے تصورات اور معجزات کی کم مائیگی کا اعتراف تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب کے شعری تجربے، قدیم معاشرتی رویوں اور نئے زمانے کے امکانات کے درمیان پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں قدیم جاگیرداری نظام اور اس کی اقدار کی پاسداری کا خیال بھی ہے اور دوسری طرف نئے عقلی رجحانات کا ساتھ دینے کا شوق بھی موجود ہے اور ان دونوں رویوں کا

Scanned by CamScanner

کشمکش سے ابھرنے والی تشکیک بھی ان کے یہاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ یہی تشکیک آج کے انسان کا ایک نہایت اہم تجربہ بن چکی ہے۔ نت نئے بدلتے ہوئے نظریات اور سائنسی سوچ کے ارتقاء نے تشکیک کا وہ جذبہ انسان کو عطا کیا ہے جو نئے امکانات کی پیدائش کا محرک بنتا اور ہر شے کو علت و معلول کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ کلام غالب کا بیشتر حصہ استفہام و استفسار اور تشکیک بھرے مضامین کا حامل ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ وساغر نہیں ہوں میں

کرتے کس منہ سے ہو غیروں کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

Scanned by CamScanner

شنیدی کہ ز آتش نہ سوخت ابراہیم
بہیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

غالب کے یہاں تہذیب قدیم کے انتشار اور بکھراؤ کا احساس نمایاں ہو گیا تھا اور انہوں نے سیاسی زوال کی بدولت شکست کھا جانے والی تہذیب کو اپنے اشعار میں سمیٹ کر آنے والی نسلوں کو عبرت دلائی تھی۔ اس ورثے کے ذریعے عبرت دلانے کے لئے زمانے کی حقیقتوں کا ادراک ضروری تھا جو غالب نے کیا۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عقل اور جذبے کو مربوط اور ہم آہنگ بنا کر جدید دور کے انسان کے ذہنی رویے کے مطابق ڈھال دیا اور زندگی کے مختلف اور متنوع تجربات کا آمیزہ تیار کر کے ایک وسیع تر تجربے کا روپ دے دیا اور یوں آئندہ عصر کی بصیرتوں اور ذہنی گوشوں کو منور کر دیا۔ ان کی یہ بصیرت کلی پرانی تہذیبی اقدار سے ایک نئی معنویت تلاش کرنے اور اس کے ذریعے مستقبل کی بشارت دینے کے قابل بناتی ہے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ غالب جاگیرداری نظام کی پیداوار اور اسی نظام حیات کے پروردہ تھے۔ اس لحاظ سے انہیں ایک جامد فرد کی حیثیت میں ابھرنا چاہیے تھا کیونکہ یہ نظام جامد سوسائٹی اور افراد کو جنم دیتا ہے لیکن غالب اس نوع کے نظام اور بے عمل سوسائٹی کا فرد ہونے کے باوجود ماحول کی گھٹن کو محسوس کرتا اور اس سے بیزاری کا واضح اعلان کرتا ہے۔ اپنے ایک فارسی خط میں مولوی سراج

الدین احمد کو لکھتے ہیں:-

"اگر میں عنفوان شباب میں وہاں (کلکتہ) گیا ہوتا اور شادی و خانہ داری کی ذمہ داریاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو مدت العمر کے لئے کلکتہ ہی میں رہ جاتا" (۳)

انہوں نے ایک نئے دور اور ایک نئے آرڈر کی تمنا اس انداز میں کی۔ جس طرح کہ آج کا ایک خلاق اور جدید تر انسان اپنے دور میں کر رہا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی ذات کو منکشف کیا اور اپنی خلاق، طباع اور جدت پسند طبیعت کا عرفان حاصل کیا، بلکہ ماضی اور حال کے ملبے میں سے ایک نئے عہد اور نئے مستقبل کی تعمیر کا خواب بھی دیکھا اور اس خواب کو "طرح نو" کی حقیقتوں میں بدلنے کی سعی بھی کی۔ اپنی ذات پر اعتماد کا یہ دعویٰ فرد قدیم کا نہیں جدید تر انسان کی سوچ کا عطیہ ہے اور احساس انفرادیت کی دین ہے۔ انفرادیت کا یہ احساس غالب کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے چند اشعار دیکھے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

انداز جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

عشق و مزدوری عشرت گہہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامئی فرہاد نہیں

Scanned by CamScanner

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
رخم کی کہتی بہ تماشا برا فگنم

انانیت اور انفرادیت کا یہ عمل انہیں عصر حاضر کا ایک ایسا فرد ثابت کرتا ہے جو مسلمہ روایات اور عقائد کے نظام سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے کی بجائے ایک نئے تہذیبی عمل کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے اور اپنے تازہ تجربوں سے قدیم پیکر کی فرسودگی کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ غالب کا سماجی شعور اس قدر حساس اور تیز ہے کہ جیسے عصر حاضر کے ایک ذہین اور باشعور انسان کا۔ وہ سماجی ناانصافیوں، سیاسی زوال اور انتشار اور اولتی بدلتی اقدار کا واضح ادارک رکھتے تھے۔ ٹوٹتے ہوئے سماج اور ابھرتی ہوئے اقدار کے درمیان وہ ہمیں ہاتھ پاؤں مارتے نظر آتے ہیں۔ اپنے لئے ایک مقام کے حصول کی خاطر ان کی کوششیں، خطابات، پنشن اور جاگیر کی بحالی کے لئے تگ و دو، وظیفے اور ملازمت کے لئے ان کی کاوشیں ایک عقل سلیم رکھنے والے عصر حاضر کے انسان کا ہیولہ تیار کر دیتی ہیں۔

یہ سماجی شعور، یہ سیاسی بصیرت، یہ زمانہ سازی، یہ مصلحت اندیشی، جاگیرداری نظام کے فرد کے خصائص نہیں ہو سکتے بلکہ صنعتی معاشرے کی پیداوار فرد کی خوبیاں ہیں، اس لئے غالب کی یہ آواز عصر حاضر کے فرد کی آواز بن کر ابھرتی ہے۔

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

Scanned by CamScanner

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی' خامہ خونچکاں اپنا

ان اشعار میں جس حساس فرد کا رد عمل ہے کیا وہ بیسویں صدی کا انسان نہیں؟ کیا یہ تجربہ میرا اور آپ کا تجربہ نہیں بن جاتا؟ انسان اور انسانی زندگی کی بوقلمونیوں کو ٹٹولنے والا یہ انسان عصر حاضر کا انسان ہے قدیم انسان نہیں ہے۔ ڈاکٹر زمان فتح پوری کے مضمون کا اقتباس یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"زندگی اور ادب دونوں کے بارے میں غالب کا ذہنی رویہ اور فنی برتاؤ اپنے معاصرین کے مقابلے میں کچھ اتنا مجددانہ اور اپنے عہد سے اتنا آگے تھا کہ ان کے زمانے کے لوگ ان کی فکر و فن کی قدروقیمت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ جن لوگوں نے غالب کی شخصیت اور کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ تجدد پسندی غالب کے مزاج کا خاصہ تھی۔ روش عام سے بچ کر چلنے اور ہر بات میں ایک نئی بات پیدا کر لینے اور زندگی و ادب کے سلسلے میں مروجہ اصول و رسوم کے مقابلے میں ابداع و بغاوت سے کام لینے کا رجحان ان میں طبعی تھا۔ اس باغیانہ رجحان کے طفیل جتنی دور تک وہ اپنے عہد اور عہد کے پیچھے کی طرف دیکھ سکتے تھے۔ اس سے کہیں زیادہ دور تک وہ اپنے عہد کے آگے بھی دیکھ سکتے تھے۔ گویا ان کی نظر صرف ماضی و حال میں اسیر نہ تھی۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مستقبل کو بھی دیکھ لینے کی صلاحیت رکھتی تھی" (۴)

کلام غالب کے بارے میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

"..... جو اشعار اپنے وقت کے آگے کی آواز ہونے کے سبب انیسویں صدی میں نامانوس و غریب تھے وہ آج بیسویں صدی کے ضمیر کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ آواز چونکہ رنگ و نسل اور زباں و مکاں کی مصنوعی سرحدوں سے آگے بڑھ کر ذہن و نفس کے اجتماعی خواص و خصائص پر حاوی ہو گئی ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ جس نسبت سے ذہن انسانی آگے بڑھتا جائے گا اور نفسیات انسانی کی گرہیں انسان پر کھلتی جائیں گی اسی نسبت سے غالب اور کلام غالب کی مقبولیت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے گا"(۵)

غالب کے یہاں زبان کی جو مختلف سطحیں اور پرتیں دکھائی دیتی ہیں وہ بھی انہیں ایک باشعور اور نئے زمانے کا فنکار ثابت کرتی ہیں۔ انہوں نے شعری زبان وضع کرنے میں جس ادارک کا ثبوت دیا وہ عصر حاضر کے انسان کا شعور ہی ہو سکتا ہے جو تجربوں کی کٹھن منزلوں سے گزر کر ایک خاص مقام تک پہنچ رہا ہے۔ انیس ناگی نے درست لکھا ہے کہ "غالب کی غزلیں ایک سے زیادہ معنی کا قرینہ مرتب کرتی ہیں کیونکہ غالب ترسیل معنی کی بجائے تشکیل معانی کے عمل پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس عمل میں وہ استعارہ سازی اور تمثال آفرینی سے مدد لیتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزلوں کی معنویت متغیر ہوتی رہتی ہے"(٦)

ڈاکٹر سعادت سعید نے غالب پر ابہام کے الزام کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"غالب کے ابہام کو لفظی موشگافیوں کا نتیجہ نہیں جاننا چاہئے۔ یہ ایک تو ان کی زبان سازی کے عمل کا حصہ ہے۔ دوسرا اس لئے بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ متخیلہ کا غیر معمولی استعمال کرتے ہیں۔ تیسرے غالب کے ہاں ابہام کی ایک وجہ ان کی تمثال سازی ہے .... جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں شاعرانہ لسانی مشقیں بھی نظر آتی ہیں اور قابل قدر تجربوں، انسانی بصیرتوں اور فلسفیانہ گہرائیوں کا اظہار بھی"(۷)

مختصر یہ کہ انانیت کا بڑھا ہوا احساس، زندگی کے جملہ مسائل و کوائف کو

Scanned by CamScanner

لفظ و معنی کے دام میں اسیر کرنے کی سعی' جذبہ و تعقل میں ہم آہنگی کی کاوش' مختلف و متنوع تجربات کو ملا کر ایک نئی معنویت کی تلاش کا جذبہ' تشکیک کا رویہ' مسلمہ روایات و عقائد کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ' ماضی اور مستقبل کے خوابوں کے درمیان کشمکش اور اپنے وسیلہ اظہار کے ساتھ آنکھ مچولی ------ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے حوالے سے غالب عصر حاضر کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱) "غالب --- ایک شاعر' ایک اداکار" ص ۲۳' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۷ء

(۲) "غالب --- شاعر امروز و فردا" ص ۲۴۴-۲۴۵ مطبوعہ اظہار سنز لاہور طبع اول ۱۹۷۰ء

(۳) بحوالہ "غالب ---- شاعر امروز و فردا" ص ۲۴۳

(۴) "غالب ---- شاعر امروز و فردا" ص ۲۵۴

(۵) "غالب --- شاعر امروز و فردا" ص ۲۶۴

(۶) "غالب --- ایک شاعر ایک اداکار ص ۸۸

(۷) --- ایضاً" ---- مطلع ص ۱۰-۱۱

Scanned by CamScanner

"فلسفہ اقبال اور اس کے ماخذ"

پس منظر:- کوئی بھی مفکر یا فلسفی ایک طبقے یا ایک گروہِ انسانی کو سامنے رکھ کر اپنا فلسفہ مرتب نہیں کرتا بلکہ اس کے پیش نظر تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہوتی ہے لیکن اس وقت کے پیش نظر کہ کسی نہ کسی ملت یا قوم کے حوالے ہی سے اس فلسفے کو عملی صورت دی جا سکتی ہے فلاسفہ عالم نے ہمیشہ ایک خاص گروہ یا کسی مخصوص قوم کو اپنے سامنے رکھا۔ علامہ اقبال کے افکار کی عمومی اپیل تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے لیکن انہوں نے بھی ایک مخصوص ملت کا تصور اپنے سامنے رکھا اور یہ ملت ہے ملت بیضائے اسلام جس کے عمومی زوال نے علامہ اقبال کو ایک مخصوص نوع کا فلسفہ پیش کرنے کی تحریک دی اور اس فلسفے کے ذریعے انہوں نے بیسویں صدی میں احیائے اسلام کی کوشش کی اور ان کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے مسلمانان عالم پر جو زوال اور انحطاط کی کیفیت شروع ہوئی تو پھر رک نہ سکی۔ یوں تو قرن ہا قرن سے ان میں بے عملی، زوال اور فرسودگی کے آثار پائے جاتے تھے لیکن اہل فرنگ کی ہوس ملک گیری اور توسیع پسندی نے اس زوال کو تیز تر بھی کیا اور اقوام مسلم کو اپنے استعار د

استحصال کا شکار بھی بنایا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے الفاظ میں۔

"مشرق و مغرب کے تصادم کی ابتداء یوں تو صلیبی جنگوں ہی سے ہو جاتی ہے لیکن وہ یورپ کا قرون وسطی اور اسلامی تہذیب و تمدن کے عروج کا زمانہ تھا۔ مسلمان ابھی دین و دنیا سے اتنے بیگانہ نہیں ہوئے تھے اور نہ ان کے قوائے علمی و عملی میں ضعف کے آثار ظاہر ہوئے تھے۔ اس لئے یورپ کے صلیبی جنگ آزماؤں کے تند و تیز زریلے ایشاء کے درو دیوار سے ٹکرا کر ناکام و نامراد واپس لوٹ جاتے رہے۔ لیکن سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں میزان توازان بدلنے لگا۔ مشرق پر جمود و غفلت کی تاریکی چھانے لگی اور مغرب میں علمی شمعیں روشن ہونے لگیں۔ مشرق میدان عمل سے پسپا ہونے لگا اور مغرب شاہراہ ترقی پر گامزن۔ ان مخالف سمتوں پر چلتے چلتے اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسویں تک مشرق میدان حرب و ضرب میں مغرب سے پوری طرح شکست کھا بیٹھا" (۱)

چنانچہ اس شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایک کر کے بیشتر اسلامی ممالک صید زبوں کی طرح مغرب کی فتراک میں گرنے لگے۔ ۱۸۸۱ء میں تیونس پر فرانس نے قبضہ جمایا۔ اس سے اگلے سال مصر برطانیہ کی گرفت میں آگیا۔ ۱۸۹۹ء میں سوڈان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی والے لیبیا پر چڑھ دوڑے۔ یہ تو تھی عرب ممالک کی صورت حال۔ ادھر ترکی کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی اس کے اتحادی ترکی نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہو کر ترکی کے حصے بخرے کرنے پر تل گئیں۔ مئی ۱۹۱۹ء میں یونانی فوجوں نے ازمیر پر قبضہ کر لیا۔(۲)

ادھر ایران میں روس اور برطانیہ کا عمل دخل شروع ہوا۔ ایران کے شمالی حصے میں روس کا دائرہ اقتدار وسیع ہوا تو دوسرے حصے میں برطانیہ کا اثر و نفوذ بڑھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں دونوں غیر ملکی فوجیں ایران میں قیام پذیر رہیں' یہ صورت حال ۱۹۲۱ء تک قائم رہی۔

Scanned by CamScanner

جہاں تک برصغیر پاک و ہند کا تعلق ہے یہاں برطانوی سامراج کے تسلط اور غلبہ کی داستان ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کے الفاظ ہیں۔

"محمد شاہ سے بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک جتنے سال گزرے ہیں وہ روز افزوں انحطاط کے سال تھے۔ فرق یہ ہے کہ ظفر کے زمانے کی دہلی میں غالباً" خود لوگوں کو بھی اس بات کا شعور حاصل ہو چکا تھا کہ قدیم تمدن اور معاشرت کی جو بساط بچھی ہوئی ہے اس کے تہ ہونے کا وقت آن لگا ہے .... آخر کار وہ دن بھی آن پہنچا جب سوا تین سو سال تک مطلع ہند پر تیموری جاہ و حشمت کا آفتاب ضیاپاشیاں کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ حتی کہ آخری مغل تاجدار کو سرزمین ہند میں دو گز زمین بھی نصیب نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۷ء میں جب فرنگی غاصبوں کے خلاف ہندوستانی سپاہیوں کی فوجی جدوجہد ناکام ہو گئی تو ملک پر برطانوی تسلط ایک تاریخی حقیقت بن گیا۔ ۱۸۵۷ء صرف سیاسی اعتبار سے ہی ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم سال کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ہماری تمدنی اور تہذیبی مسافت کا بھی ایک یادگار موڑ ہے۔ اس سیاسی انقلاب کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بنے حکمرانوں کے نزدیک مقہور و مردود ٹھہرے اور فرنگیوں کے جذبہ انتقام کا نشانہ بنے" (۳)

مزید تفصیل میں جائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال مسلمانوں کے اس ہمہ گیر زوال سے متاثر ہو کر اپنے افکار کے ذریعے مسلمانوں کی سیاسی' مذہبی' سماجی' تہذیبی اور فکری افسردگی اور ناامیدی کو عمل پیہم اور بیداری میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے جس فلسفے کو منضبط اور مربوط انداز میں پیش کیا اسے فلسفہ خودی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۔ خودی کا مفہوم:۔ فارسی اور اردو میں خودی کے دو مختلف

مفہوم لئے جاتے رہے ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت۔ منفی مفہوم کے تحت خودی کو غرور و تکبر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کسی فرد کی مذموم صفت شمار ہوتی ہے۔ صوفیاء کے نزدیک "خودی" ایک منفی رویہ رہا ہے اس لئے ان کے نزدیک خود کو مٹانے کی تلقین ملتی ہے کیونکہ خود کو مٹائے بغیر حقیقت مطلقہ اور مسرت ابدی کا حصول ممکن نہیں۔ ایک عرب شاعر نے کہا "تیرا وجود وہ گناہ ہے جس کے ساتھ کا گناہ خیال اور قیاس میں نہیں آ سکتا" اسی طرح ابو العالی معری کا قول ہے کہ "جو گناہ میرے باپ نے میرے ساتھ کیا وہ میں اپنی اولاد کے حق میں نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے مادہ کی نفی کی خاطر ساری زندگی شادی نہ کی۔ اسی طرح کہا گیا "بہ مار سیہ منیش وبہ خود منشیں" ----- محمود شبستری کا شعر ہے۔

خراباتی شدن از خود رہائی است
خودی کفر است گر خود پارسائی است

ویدانیت کے فلسفے نے وجود کو خطرناک قرار دیا۔ بدھ مت نے بھی خواہشات اور آرزوؤں کو مٹانے کی تلقین کی۔ اقبال نے خودی کے ان مروجہ منفی مفاہیم سے ہٹ کر خودی کو مثبت معنوں میں استعمال کیا۔ اقبال نے اس کا مفہوم غالباً" اس حدیث سے لیا۔

من عرف نفسہ لقد عرف ربہ

(جس نے اپنے نفس (وجود) کو پہچانا تو بے شک اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)

اقبال کے نزدیک خودی خود کے اس احساس کا نام ہے جو نہ صرف انسان کے نفس میں موجود ہوتا ہے بلکہ تمام مادی اشیاء حتی کہ بے جان چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اقبال نے ایک موقع پر فرمایا کہ یہ احساس وجود میں تناؤ کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور یہ تناؤ انسان کو حرکت پر اکساتا ہے اور یہ حرکت عمل کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح جدوجہد کی آرزو اور قوت پیدا ہوتی ہے جس سے خودی قائم و دائم رہتی ہے۔ خودی کوئی خوابیدہ قوت نہیں بلکہ یہ وسعت کی متقضی ہے۔ اس وسعت

Scanned by CamScanner

ملی میں خودی غیر خود، ماحول اور فطرت سے ٹکراتی ہے۔ اس کشمکش میں خودی کے کمزور یونٹ تو ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن مضبوط یونٹ ماحول پر قابو پا کر زندگی کی ندی کو تیزی اور بہاؤ کے ساتھ رواں دواں رکھتے ہیں۔

اقبال نے بعض مقامات پر خودی کی ماہیت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ یہ ہیں۔

(۱) میرے نزدیک خودی احساس نفس اور تعین ذات کا نام ہے۔

(۲) میرے نزدیک خودی کا مرکز خود شخصیت ہے جس کو کشاکش کے ذریعے برابر تقویت ملتی ہے۔

(۳) "خودی ایک روشن نقطہ مستنیر ہے"۔

(۴) یہ ایک وحدت وجدانی ہے اور شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات مستنیر ہوتے ہیں۔

(۵) خودی وہ پر اسرار شے ہے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود چیزوں کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔

اقبال کے کچھ اشعار کے ذریعے خودی کا مفہوم دیکھیے:۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہرچہ می بینی ز اسرار خود است

اسرار خودی

(یعنی زندگی کا وجود خودی کا مرہون منت ہے اور کائنات کی ہر شے خودی کے اسرار میں سے ہے)

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

بال جبریل

(گویا خودی سے مراد خود آگاہی ہے)

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

بال جبرئیل

(گویا خودی حیات کی ترقی یافتہ شکل ہے)

خودی کیا ہے راز درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

بال جبرئیل

(یعنی خودی حیات کا سرچشمہ بھی ہے اور کائنات کی تسخیر کا جذبہ بھی)

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

(یعنی خودی ایک لامحدود سمندر کی طرح ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے)

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

ضرب کلیم ص ۳۰

ہو اگر خود نگر و خود گر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

ضرب کلیم ص ۳۱

(گویا خودی سے متصف فرد ابدی حیات کا مالک ہوتا ہے)

وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود

ضرب کلیم ص ۳۴

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

Scanned by CamScanner

ضرب کلیم ص ۶۸

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکت صبح و شام سے آگاہ

ضرب کلیم ص ۸۷

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوۂ فقیر

ضرب کلیم ص ۸۷

خودی ہو زندہ دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر

ضرب کلیم ص ۸۶

(یعنی خودی کے سامنے بے کنار دریا پایاب ہوتا ہے اور کہسار راستہ نہیں روک سکتے)

نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل
(یعنی حسن کی بنیادی شرط خودی ہے)

۳۔ جدل و پیکار کی ضرورت :۔ اقبال کے نزدیک خودی کی ترقی کے لئے پیکار بہت ضروری ہے اور اس پیکار میں شر کی قوتوں کی اہمیت ابھرتی ہے۔ اسرار خودی میں فرماتے ہیں۔

در جہاں تخم خصومت کاشت است
خویش را غیر خود پنداشت است
سازد از خود پیکر اغیار را
تافزاید لذت پیکار را

یعنی دنیا کے اندر دشمنی کا بیج بویا اور خود سے غیر خود پیدا کرکے پیکار کی

لذت کو بڑھایا۔ دراصل خودی کے استحکام اور تکمیل میں قانون پیکار ایک ضروری ضرب ہے کیونکہ اس آویزش میں خودی کی صالح قوتیں ابھرتی ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال ہیگل کے فلسفہ جدلیات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ہیگل کا خیال تھا کہ زندگی کی ذہنی پیکار کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ دو اعلیٰ قوتوں کے مابین عظیم ذہنی تصادم سے انسانی آزادی کی تخلیق ہوتی ہے۔ مارکس بھی ہیگل کے خیالات سے بہت متاثر تھا اور اس نے اپنی مادی جدلیت کا نظریہ اس بنیاد پر استوار کیا تھا۔ اقبال نے بھی پیکار کا نظریہ ہیگل سے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں شرکی قوتوں کو بڑی اہمیت ہے۔ (تفصیل کے لئے اس کتاب کا مضمون "اقبال کا نظریہ خیر و شر" ملاحظہ کیجئے) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو نفس کو جدل اور پیکار پر ابھارتی ہے۔ اسرار خودی میں اقبال نے اس کا جواب دیا ہے کہ اس پیکار کو جاری رکھنے والی چیز مقاصد کی لگن، جستجو اور آرزو ہے۔ ان کے خیال میں زندگانی کی بقاء اور کاروان حیات کو رواں دواں رکھنے والی چیز مدعا اور مقصد ہے۔ حیات اور اصل حیات جستجو اور آرزو میں پوشیدہ ہے۔ جہاں رنگ و بو کی روح آرزو ہے تمنا کی بدولت دل سینے میں رقص کرتا ہے اور اس کے نور سے سینہ آئینہ بن جاتا ہے۔ یہ خاک کو طاقت پرواز اور موسیٰ ادراک کے لئے خضر ثابت ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد آسمان سے بھی بلند تر ہے۔ یہ دل ربا بھی ہے دلستان بھی اور دلبر بھی۔ حتیٰ کہ تخلیق مقاصد ہی کی بدولت ہم زندہ و پائندہ ہیں اور شعاع آرزو سے تابندہ ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

زندگانی را بقا از مدعاست
کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو جان جہاں رنگ و بوست

فطرت ہر شے امین آرزو ست
از تمنا رقص دل در سینہ ہا
سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
طاقت پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسیٰ ادراک را
ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

(اسرار خودی ص ۱۵-۱۷)

گویا تخلیق مقاصد سے خودی کو تقویت پہنچتی ہے اور مقاصد کے حصول کے لئے خودی ماحول سے ٹکرلیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان

"اقبال کے نزدیک زندگی کا اصل محرک اثبات خودی کا وہ جذبہ ہے جو انسان میں ودیعت ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشوں کی تخلیق کرتی ہے اور اس طرح اپنی توسیع و بقاء کا سامان مہیا کرتی ہے۔ پیہم کشمکش سے لازوال ہوتی ہے۔ خودی یا ذات کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ فطرت ہے جس پر غلبہ پانا ضروری ہے۔"

(روح اقبال)

فطرت پر غلبہ پانے کے بعد ہی تو راز حیات کھلتا ہے اور یہی خودی کی معراج ہے۔

خودی کیا راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

(بال جبریل)

۴۔ تصور عشق و عقل:۔ اقبال کے نزدیک خودی کو مستحکم کرنے

کے لئے سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے۔ دراصل زندگی کا عمل بہت سخت ہے اور جو انسان کو ثابت قدم رکھتی ہے وہ جذبہ عشق ہے جو انسان کے علاوہ دوسری اشیاء میں بھی جاری و ساری ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کا لفظ کلیشے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اب تک عشق کے بارے میں جو تصور عام رہا ہے وہ بقائے نوع کا جسمانی جذبہ ہے۔ فرائڈ نے تو اس جذبے کو مرکزی اہمیت دے کر اسے تخلیق کائنات کا سرچشمہ قرار دیا۔ ہماری اردو شاعری میں بھی عشق جنسی جذبے کی بازگشت کا نام رہا ہے۔ گریباں چاک سر میں خاک مارے مارے کوچہ و بازار میں پھرنا اور محبوب کو رسوا و بدنام کرنا عشق کا پرانا دستور رہا ہے۔ ہوش و خرد سے بے نیازی، صحرا نوردی، عاشق کی وفائیں اور معشوق کی جفائیں، وصل کی خواہشیں اور ہجر کی کاہشیں ------ یہ عشق کی کائنات میں شامل رہا ہے۔ لیکن اقبال کا تصور عشق اس معنویت سے ماوراء کچھ اور ہی مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے فکر اقبال میں لکھا ہے کہ خودی کا اصل طریق عمل مخاصمانہ یا رقیبانہ نہیں بلکہ عاشقانہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ خودی کی ماہیت یا اس کے کمال کے لئے تسخیر ضروری ہے مگر اس تسخیر کے لئے مخاصمت یا رقابت نہیں عاشقانہ جذبے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ خودی تسخیر کے لئے عشق کو وسیلہ بناتی ہے اور جب خودی عشق سے کام لیتی ہے تو یہ محض مادی جذبہ نہیں رہتا بلکہ اس میں ہمارا اخلاقی اور روحانی احساس بھی شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر خودی روحانی و اخلاقی عنصر کا سہارا نہ لے تو ظلم، سرتابی اور تشدد کا ذریعہ بن جائے (شیطانی خودی کی مثال) چنانچہ عشق اقبال کی شاعری میں محض جبلی جذبہ نہیں رہتا بلکہ اچھائی برائی کی تمیز کا اہل بن جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک عشق نہ صرف نوائے زندگی میں زیر و بم کی کیفیت پیدا کرتا ہے بلکہ مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم بھی اس کی بدولت ہے۔ یہ باغوں کو باد فرور دیں عطا کرتا ہے تو راغوں کو پروین جیسے غنچے دیتا ہے۔ اس کی ایک شعاع

Scanned by CamScanner

قلزم شگاف ہوتی ہے اور مچھلی کو پانی میں نگاہ راہ بیں عطا کرتی ہے۔ یہ کون و مکاں کی تخلیق کا باعث بھی بنا اور یہی زندگی کا انجام بھی ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق خودی کو استوار اور مضبوط کرنے والا جذبہ ہے جو مقاصد کی تخلیق سے امکانات کی دنیا روشن کرتا ہے اور اپنی بقاء کا سامنا کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان

"عشق سے اقبال کی مراد وہ جوش وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کے تانے بانے سے ذات اپنی بقائے صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیل ذات کے لئے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ ہر قسم کے موانع پر قابو پاتا ہے۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصا مستی، انہماک اور جذب کلی ہے۔ اس سے انسانی ذہن زماں و مکاں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے اور لزوم و جبر کی دائمی زنجیروں سے چھٹکارا پاتا ہے" (روح اقبال)

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

بہ باغاں باد فرور دیں دہد عشق
بہ راغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است
بہ ماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

اقبال نے حسن کو بھی عشق ہی کے مظاہر میں شمار کیا ہے حالانکہ ایک نظریے کے مطابق حسن ازلی ایک سرمدی حقیقت ہے۔ اس حقیقت نے اپنی خود نمائی کے لئے عشق کو پیدا کیا۔ ایک حدیث قدسی ہے۔

"کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق"

Scanned by CamScanner

(یعنی اللہ تعالی نے فرمایا کہ "میں ایک چھپا ہوا خزانہ (حسن) تھا۔ پھر میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو پس میں نے کائنات بنادی)

اس سے یہ سراغ ملتا ہے کہ حسن نے عشق کو پیدا کیا لیکن اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ عشق نے حسن کی آفرینش کی۔

خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں

"اقبال اس طرف مائل معلوم ہوتے ہیں کہ اصل قوت تکوین و ارتقاء عشق ہے اور حسن اس کے مظاہر میں سے ہے۔ عشق کی جدت آفرینی سے صرف عالم رنگ و بو ہی نہیں بلکہ ہیشروہ ہزار عالم ظہور پذیر ہوئے۔ بظاہر پیدا و ناپید ہوتے رہتے ہیں لیکن عشق کو دوام ہے"

(فکر اقبال)

علامہ اقبال عشق کی ابدیت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من
ہنگامہ ایں محفل از گردش جام من
ایں کوکب شام من ایں ماہ تمام من
اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تاچند
مرگ است دوام تو عشق است دوام من

اقبال کے نزدیک عشق ہی زندگی کی بنیاد ہے۔ اسی لئے ہر حقیقی مظہر عشق ہی کا مظہر ہے۔ حیات انسانی کی صحیح رہنمائی بھی عشق ہی کی بدولت ممکن ہے۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک عشق اخلاقیات اور شعور دونوں کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال عقل پر عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی کتاب "فکر اقبال" میں ایک جملہ لکھا ہے کہ اقبال کے تصور میں عشق کی عقل کے ساتھ آمیزش بھی ہے اور آویزش بھی۔ یعنی جہاں تعقل ذہن، حجت اور سبب غالب آ

جائیں وہاں اقبال عقل کے مخالف ہیں لیکن جہاں اس میں عرفان شامل ہو تو وہاں عقل و عشق کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہ عقل نورانی یا عقل یزدانی ہے جو عشق ہی کا پرتو ہے۔

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

دراصل بعض لوگ جذبے کو بے شعور سمجھتے ہیں یعنی "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا" ---- لیکن جدید فکر نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جذبہ عقل و شعور سے الگ نہیں بلکہ جذبہ ہمارے شعوریات کی تجلیات کا نام ہے چنانچہ جذبے اور شعور کے درمیان خلیج حائل کرنا صحیح نہیں ہے۔ شعور تو جذبے کی ماہیت ہی میں شامل ہے کیونکہ جذبے کے دو کام ہیں۔

(۱) Congnition یعنی آگہی اور معرفت

(۲) Continuity یعنی ثبات اور تسلسل

ہمارے یہاں ایک مستقل دبستان ہے جو اس یقین کا حامل ہے کہ مجذوبی اور عاشقی بیک وقت شعور بھی دیتی ہے اور لذت بھی جو کہ جسمانی اور روحانی دونوں طریقوں کی ہو سکتی ہے۔ جنوں سے بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ خود صوفیوں کے نزدیک جذبے میں جوش حیات' سیرت حیات اور عرفان حیات شامل ہے۔ برگسان کا Vitalism بھی کم و بیش اسی طرح انسانی جبلتوں سے جوش حیات اور عرفان حیات کا نظریہ قائم کرتا ہے۔ البتہ اقبال محض عقل کو اپنا رہنما بنانا پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت کا ادراک کس ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ سوچ رکھنے والے ایک گروہ کا خیال ہے کہ ادارک حقیقت محض حواس کے ذریعے

ممکن ہے۔ دوسرا گروہ اس صلاحیت کو ناقص قرار دے کر صرف عقل و برہان اور ذہن کو وسیلہ بناتا ہے۔ ایک ایسا گروہ بھی ہے جسے سرے سے اس بات میں بھی شبہ ہے کہ فکر انسانی کی رسائی اصل تک ہو بھی سکتی ہے لیکن ان سب کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس یقین کا حامل ہے کہ انسان حقیقت کی پہچان کر تو سکتا ہے مگر وجدان کے ذریعے سے۔ دوسرے لفظوں میں کل کو تجزیاتی انداز میں نہیں مجموعی صورت میں ایک خصوصی حس اور جذبے کے تحت پہچانا جا سکتا ہے۔ اس خصوصی حس کو وجدان کا نام دیا جا سکتا ہے اور اس فکر پر مبنی نظام کو وجدانیت کہتے ہیں۔ افلاطون نے غالباً" اسی حس کو چھٹی حس قرا دیا تھا۔ مولانا روم، امام غزالی، برگسان اور اقبال اسی (گروہ) کے ممتاز نمائندے ہیں، اقبال نے ہر دور میں اپنے خیالات کو اشعار کی صورت میں پیش کرکے خرد و نظر اور عقل و عشق کے فرق کو واضح کیا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ راہ گزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

دراصل اقبال کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرات رندانہ کی کمی ہے یعنی بجائے خود وہ تخلیق کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی جب تک کہ عشق و وجدان اس کی پشت پناہی پر موجود نہ ہوں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

Scanned by CamScanner

دراصل اقبال نے جس عقل کی کوتاہیوں کو ظاہر کیا ہے وہ عقل جزوی یا عقل برہانی ہے لیکن عقل کلی یا عقل نورانی میں ادراک کی صلاحیت موجود ہے۔ اس لئے عشق اور خودی ایک لحاظ سے ہم معنی الفاظ بن جاتے ہیں۔ اقبال نے عشق اور فن کے رابطے پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال فن کی تخلیق کو عشق سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اعلی فنون کے پیچھے خون جگر کی کار فرمائی موجود ہوتی ہے۔ فن کا کام حسن کا تصور پیدا کرکے مسرت و حظ آفرینی کا جذبہ ابھارنا بھی ہے اور زندگی کی بلند اقدار اور بصیرتوں کو سامنے لانا بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا تصور عشق اپنے ہر پہلو میں فلسفہ خودی کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہے۔ ان کے یہاں عشق، جذبہ ارتقاء، ذوق تخلیق، ذوق تسخیر اور استحکام خودی ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔

۵۔ خودی کے مراحل:۔ خودی کی تربیت کے تین مراحل اقبال نے مقرر کئے ہیں لیکن اس نظام کے دو حصے ہیں ایک منفی دوسرا مثبت، منفی لحاظ سے نفس انسانی کی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ سوال اور گدائی سے اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ نفس انسانی کو غیور ہونا چاہیے

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

اقبال کے نزدیک ان تمام عناصر سے بچنا بھی ضروری ہے جن سے خودی مجروح ہوتی ہے مثلاً" وہ تمام فلسفہ اور آرٹ ان کے خیال میں مضر ہے جو خود کو گرا دے یا جس میں خود شناسی نہ ہو۔ اقبال کے خیال میں فن زندگی کی اعلی اقدار کے حصول کا گراں قدر ذریعہ ہے۔ شاعری حیات ابدی کا نسخہ تجویز کرے، حوصلہ

Scanned by CamScanner

ادراجرات عطا کرے ' معاشرتی ترقی کا ذریعہ بنے (اور دیدۂ بینائے قوم) ملت خوابیدہ کو
بیدار کرے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کو نصب العین بنائے۔ یہاں تک کہ
اقبال اس علم کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں جو خودی کی پہچان سے عاری ہو۔

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ

علم میں دولت بھی ہے ' قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
شیخ کتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں کتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے بیچارے مولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

مثبت نظام میں خودی کی تربیت کے لئے اقبال نے اطاعت کو پہلا مرحلہ
قرار دیا۔ یعنی اس قانون حیات کی پابندی جس کو مخلوق کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔
خلیفہ عبدالحکیم کیمطابق پہلا مرحلہ اطاعت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کی
خودی خود سری نہیں۔ حکمرانی کے لئے پہلے حکم برداری کی مشق مسلم ہے
.... انسان کو خدا اختیار ورزی کی مشق کرانا چاہتا ہے تاکہ وہ فطرت کے جبر
سے نکل کر اپنے اختیار سے فضیلت کوش اور خدا طلب بن سکے"۔ (۳)
چنانچہ اقبال نے اطاعت کوشی کو خودی کی تربیت کا ضروری حصہ قرار دیا

Scanned by CamScanner

ہے کیونکہ جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح پھول کی قید ہوا کو خوشبو اور نافہ آہو کی قید بو کو مشک بنا دیتی ہے اسی طرح آئین کی پابندی انسان کو با اختیار بناتی ہے۔ ستارہ اپنی منزل کی طرف ایک آئین ہی کے تحت گامزن ہوتا ہے اور سبزہ آئین نمو کے تحت پھلتا پھولتا ہے۔ لالہ کا دستور پیہم سوختن ہے۔ قطرے آئین وصل کے تحت دریا اور ذرے اسی قانون کے تحت صحرا بنتے ہیں۔ اقبال کی تلقین ہے کہ انسان کو اپنی خودی کی تربیت کے لئے "حدود مصطفیٰ" کا پابند ہونا چاہیے۔ ان افکار کو اقبال کے آئینہ اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار
ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند
خویش را زنجیری آئین کند
باد را زندان گل خوشبو کند
قید بو را نافہ آہو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم
پیش آئینے سر تسلیم خم
سبزہ بر دین نمو روئیدہ است
پایمال از ترک آن گردیدہ است
لالہ پیہم سوختن قانون او
بر جہد اندر رگ او خون او
قطرہ ہا دریاست از آئین وصل
ذرہ ہا صحرا است از آئین وصل
شکوہ سنج سختی آئین مشو
از حدود مصطفیٰ بیرون مرو

مومناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج
حب دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

ان پابندیوں کی اطاعت کے بعد انسان اپنے اونٹ جیسے نفس پر قابو پالیتا ہے۔ یعنی وجود کی ادنیٰ قوتوں کو قابو میں لا سکتا ہے۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خودسر است
مرد شو آور زمام او بکف
تاشوی گوہر اگر باشی خزف

ان دونوں مدارج سے گزرنے کے بعد انسان جس مرتبہ بلند پر فائزہ ہوتا ہے اسے ڈاکٹر عابد حسین کے الفاظ میں "انسانیت کا اوج کمال سمجھنا چاہیے" (مضامین عابد) خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:۔

"اقبال کے ہاں خودی کا تصور در حقیقت قرآن حکیم کے نیابت الٰہی کے تصور کا آئینہ ہے۔ خدا کی ذات لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ خدا کی مشیت اور قوت کے سامنے خاک و افلاک، ذرہ و خورشید سب سربسجود ہیں، قرآن حکیم میں جس نصب العینی آدم کا تصور پیش کیا گیا ہے، وہ بھی مسجود ملائک ہے .... یہ نائب حق ترقی کرتا ہوا جزو و کل سے آگاہ ہوتا ہوا قائم بامراللہ ہو جائے گا۔ اس نائب حق یا خلیفہ اللہ کی فطرت صرف موجودہ عالموں ہی کی تسخیر نہیں کرے گی بلکہ وہ خدا کی خلاقی سے بہرہ اندوز ہو کر ہیژدہ ہزار جدید عوالم بھی وجود میں لا سکے گی۔ اس فطرت کی لامتناہی ممکنات سے لبریز ہوگی جو نمود کے لئے بے تاب ہوں گے" (۵)

۶۔ تصورِ انسان کامل:۔ گویا ان مدارج سے گزر کر ہی اقبال کے

کامل انسان کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ تمام احوال و لوازم، شرائط و قوانین، جن سے اقبال کا نظریہ خودی صورت پذیر ہوتا ہے جب کسی ایک فرد میں ظہور پاتے اور اس کے کردار کا جزو بن جاتے ہیں تو اقبال کا مرد کامل جنم لیتا ہے جو دنیا میں نائب حق کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ اقبال کا انسان کامل تصور خلافت اسلامیہ پر مبنی ہے۔ یہ انسان تخلقو ابا خلاق الله کا نمونہ ہوتا ہے انی جاعل فی الارض خلیفة اور لقد خلقنا انسان فی احسن تقویم کی عملی تفسیر ہے۔ اقبال نے انسان کامل کا تصور قرآن اور حدیث کے علم پر استوار کیا ہے لیکن مغربی اور مشرقی فلاسفہ عالم سے بھی استفادہ کیا ہے۔ افلاطون نے اپنی تصنیف "ریپبلک" میں ایک ایسے انسان کی تمثیل پیش کی ہے جو اندھیرے سے اجالے کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس نے اپنے تصوری انسان کی تربیت کے مراحل بھی مقرر کئے ہیں۔ یہی تربیت یافتہ انسان اس کی مثالی ریاست کا مقتدر طبقہ بنتا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں اقبال نے مردِ کامل کا تصور نطشے کے سپر مین سے اخذ کیا۔ لیکن اقبال نے خود نکلسن کے نام خط میں اس خیال کی تردید کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کو نطشے کا تعمیر خودی، طاقت اور خودی کو مستحکم کرنے کا نظریہ پسند آیا لیکن دونوں کے درمیان مثالی انسان کے سلسلے میں خاصا اختلاف ہے۔ نطشے کا فوق البشر صداقت کا معیار محض قوت کو سمجھتا ہے۔ اس کے یہاں انفرادی خود اختیاری کا زور ہے۔ وہ کسی اخلاق کا قائل نہیں۔ وہ خدا کا منکر ہے۔ وہ موجودہ نوع انسان کو گری ہوئی مخلوق تصور کرتا تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں نطشے کے نزدیک

"موجودہ نوع انسان ایک بہت گئی گذری مخلوق ہے عجز و انکسار کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم نے اس کے اقدار حیات کو پلٹ کر انسان کو راضی بہ تذلیل اور مائل بہ انحطاط کر دیا ہے............ رحم کوئی فضیلت نہیں بلکہ حیات کش ہونے کی وجہ سے ایک مذموم صفت ہے جو کمزوری کی اخلاقیات نے اپنی حفاظت کے لئے ایجاد کی ہے۔ رحمٰن و رحیم خدا بھی بیکار ہے اور رحیم انسان بھی غلامانہ ذہنیت رکھتا ہے .... زندگی کو فوق البشر انسان کا انتظار ہے جس کی اخلاقیات موجودہ اخلاقیات سے بالکل

Scanned by CamScanner

برعکس ہو گی ...... نطشے خدا کا منکر تھا اور تمسخر سے کہتا تھا کہ لوگوں کو ابھی تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ خدا مر چکا ہے (نعوذ باللہ)۔ اس کے ہاں نفس یا روح کا تصور بھی اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مادی یا جسمانی یا حیوانی قوتوں کا مظہر ہے" (۶)

ظاہر ہے کہ نطشے کے اس غیر اخلاقی، بے رحم اور طاقت کے نشے میں چور فرد کا رشتہ ملت اور کائنات کے ساتھ غیر معین ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اقبال کا انسان کامل اخلاق حسنہ کا نمونہ، توحید پرست اور جلیل و جمیل ہے۔ اپنوں کے لئے حریر و پرنیاں اور باطل قوتوں کے لئے سیرت فولاد ہے۔ اقبال کا مثالی انسان جماعتی زندگی کی اخلاقی اقدار کا تابع ہے۔ وہ ایک متمدن انسان ہے گویا نطشے کا فوق البشر چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر کی مثال ہے جبکہ اقبال کا مثالی انسان خیر البشر ہے۔ انسان کامل کی بہتر مثال حضور اکرم ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔

عبدالکریم الجیلی کے خیال میں انسان بجائے خود ایک عالم ہے جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے۔ انسانی ہستی ذات باری تعالیٰ کی خارجی شکل ہے۔ انسان کامل تخلیق کائنات کا اصل مقصد ہے۔ اصل میں جیلی کا تصور انسان کامل مابعد الطبعیات اور الٰہیات میں خاصا الجھا ہوا ہے۔ وہ محض اعلیٰ ترین روحانی اقدار کا حامل ہے اور ان کے تصور میں بہت شدت ہے جب کہ اقبال کا نظریہ جیلی سے ہٹ کر اخلاقیات، سماجیات اور نفسیات پر قائم ہے۔ رومی کے یہاں کچھ اشعار میں ایک مثالی انسان کی آرزو ملتی ہے۔

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو دد ملوم و انسانم آرزو ست
ایں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

"مولانا رومی نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ

کا ایک واقعہ تمثیلاً پیرایہ میں بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کامل کائنات میں گم نہیں ہو سکتا بلکہ خود کائنات اس کے اندر گم ہو جاتی ہے۔" (۶)

اقبال کا بھی یہی خیال ہے

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

لیکن مولانا روم کے یہاں انسان کامل کے سلسلے میں ویسی تفصیلات موجود نہیں جیسی اقبال کے یہاں ہیں۔ مزید یہ کہ مولانا روم کے تصوری انسان کا رشتہ اجتماعی سطح پر واضح نہیں ہوتا۔ اقبال کا مرد کامل زندگی کی متضاد خوبیوں کا مالک ہے۔ اس میں بیک وقت جلال و جمال "دلبری و قاہری" "درویشی و سلطانی" کی خوبیاں موجود ہیں وہ ہر لحظہ نئی تخلیق اور ہر لحظہ نئے افکار کا موجد ہے۔ وہ مادہ کی تسخیر کے بعد عوالم دیگر پیدا کرتا ہے۔ وہ تقدیر سے شکست نہیں کھاتا بلکہ اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ وہ مرد ماہ کا طالب ہے۔ الہام کا مرکب نہیں راکب ہے۔ اس کے علاوہ

از رموز جزو و کل آگہ بود
در جہان قائم بامر اللہ بود
فطرتش معمور و می خواہد نمود
عالمے دیگر بیارد در وجود
صد جہان مثل جہان جزو و کل
روید از کشت خیال او چو گل
پختہ سازد فطرت ہر خام را
از حرم بیرون کند اصنام را
شیب را آموزد آہنگ شباب
می دہد ہر چیز را رنگ شباب
نوع انسان را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

خشک سازد ہیبت او نیل را
می برد از مصر اسرائیل را
ذات او توجیہ ذات عالم است
از جلال او نجات عالم است

اقبال اسی انسان کامل کے انتظار میں ہیں۔

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامہ ایجاد شو
در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن
نغمہ خود را بہشت گوش کن
خیز و قانون اخوت ساز دہ
جام صہبائے محبت باز دہ
نوع انسان مزرع و تو حاصلی
کاروان زندگی را منزلی
ریخت از جور خزاں برگ شجر
چوں بہاراں بر ریاض ما گذر

مختصر یہ کہ اقبال کا انسان کامل ان کے نظریہ خودی کی عملی شکل ہے اور نیابت الٰہی کا درجہ حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین مقصد ہے۔ اس کی تلاش میں کائنات روز ازل ہی سے بے قرار ہے۔ طالب خودی اس خدا کی محبت میں جو خودی کے لحاظ سے بہتر و برتر ہے سرشار ہو جاتا ہے لیکن انسان اپنے دائرہ ارتقاء میں خودی کے کل مراحل طے کرنے کے بعد بھی ناقص و ناتمام رہتا ہے اور کمال کا وہ جلوہ جو اسے ذات مطلق میں دکھائی دیتا ہے اسے بے ساختہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اسی کشش کا ماخذ د

Scanned by CamScanner

نفی خودی ہے اور اس کی تین منزلیں ہیں۔

(۱) آرزو و جستجو

(۲) دیدار

(۳) وصل

صوفیاء کے یہاں یہ تینوں منزلیں موجود ہیں اور سالک ان کو طے کرکے وصل سے شاد کام ہوتا ہے لیکن اس وصال میں اپنی ذات کو گم کر دیتا ہے۔ قطرہ دریا میں فنا ہو جاتا ہے اور اپنی ہستی کھو دیتا ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں صوفیاء کے برعکس عشق کی صرف پہلی دو منزلیں تو ہیں تیسری کوئی منزل نہیں کیونکہ اقبال نفی خودی یا زوال خودی کے سخت خلاف ہیں یہاں تک کہ اگر ان کے وجود کے ارتقاء میں ذرا سی بھی کمی آ جائے تو وہ اس کے بدلے میں حیات جاوداں بھی لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اگر یک قطرہ کم گردد ز انگیز وجود من

بہ ایں قیمت نمی گیرم حیات جاودانی را

گویا ڈاکٹر سید عبد اللہ کے الفاظ میں "اس نقطہ نظر میں اقبال اور صوفیوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ جتنا مشرق و مغرب میں ہے۔ اقبال بے خودی کے لئے خود کو وسیلہ بناتے ہیں۔ صوفی خود کا اثبات اس میں دیکھتا ہے کہ خود کے احساس ہی کو مٹا ڈالا جائے۔ ایک کی نظر اس پر ہے کہ ازل میں ہم میں خدا میں کوئی بعد نہ تھا۔ بلکہ ہم شے واحد تھے۔ دوسرے کی نگہ اس پر ہے کہ ازل کی بحث سے کیا فائدہ؟ ایک دن ایسا آئے گا جب خدا ہم میں جذب ہوکر رہ جائے گا اور اب ہم اس کی جستجو میں نہیں ہیں وہ ہماری جستجو میں ہے" (۸)

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است

چوں ما نیازمند و گرفتار آرزو است

در خاکدان ما گہر زندگی گم است

آں گوہرے کہ گم شدہ مائیم پاک اوست

اقبال کے نزدیک نفس انسانی لذت دیدار سے سرشار ہونے کے بعد بھی معنی مطلق سے جدا رہتا ہے اور درد فراق میں تڑپتا رہتا ہے۔ اسی میں اس کی حیات ابدی اور زندگی جاوید کا راز پوشیدہ ہے۔

۷۔ خودی اور بے خودی کا ربط و ضبط:۔ خودی کی ترتیب تکمیل کے بعد اقبال نے اس انفرادی خودی کی تمام تر صلاحیتوں اور قابلیتوں کو اجتماعی خودی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اقبال کا تمام تر نقطہ نظر اجتماعی برکتوں کا طالب ہے۔ فرد اور ملت کے ربط کے بغیر ان کے نظریات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ انفرادی خود اختیاری کے قائل اسی وقت بنتے ہیں جب یہ خود اختیاری اجتماعیت کا ناگزیر حصہ قرار پائے۔ رموز بے خودی میں انھوں نے اس رشتے کی وضاحت تفصیل سے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ فرد کے لئے ربط ملت رحمت کا باعث ہے اور اس کے جوہر کی نمود ملت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ جماعت ہی فرد کی توانائی کا سبب بنتی ہے۔ خیر البشرؐ کا فرمان ہے کہ جماعت سے دور ہونے والا شیطان ہے۔ فرد اور قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سلک اور گوہر، کہکشاں و اختر۔ فرد کو ملت کے سبب احترام ملتا ہے اور ملت کو افراد کی بدولت نظام حاصل ہوتا ہے۔ فرد جب جماعت میں گم ہو جاتا ہے تو گویا قطرۂ وسعت طلب قلزم بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں ملت ہی کی وجہ سے ذوق نمو پیدا ہوتا ہے اور اس کے عمل کا احتساب بھی ملت ہی کرتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن اور جسم و روح سب قوم کی بدولت ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است
ناتوانی باجماعت یار باش

رونق ہنگامہ احرار باش
حرز جاں کن گفتہ خیر البشر
ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند
سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد میگیرد زملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
دردیش ذوق نمو از ملت است
احتساب کار او از ملت است
پیکرش از قوم وہم جانش زقوم
ظاہرش از قوم و پنہانش زقوم
پختہ تر از گرمی صحبت شود
تا بمعنی فرد ہم ملت شود

خودی اگر بے خودی کی شناخت نہ کرے تو گمانوں میں گھر جاتی ہے۔ لیکن جب فرد کی خودی ملت میں ضم ہو جاتی ہے تو فیض و برکت کا باعث بن جاتی ہے۔

در جماعت خود شکن گردد خودی
تاز گلبرگے چمن گردد خودی

خودی کی تربیت کی طرح بے خودی کی تربیت اور تنظیم کے لئے بھی اقبال نے ایک دستور تجویز کیا ہے۔ ان کے نزدیک ملت اختلاط افراد سے بنتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوت ہے۔ جس طرح اجرام فلکی باہمی کشش اور باہمی تجاذب سے قائم ہیں اسی طرح افراد کے ربط سے ملت قائم و دائم ہے۔ مولانا روم نے فرمایا۔

Scanned by CamScanner

میل ہر جزوے بہ جزوے می نہد
ز اتحاد ہر دو تولیدے جہد

علامہ اقبال نے کہا

محفل انجم ز جذب باہم است
ہستی کوکب ز کوکب محکم است

ملت اسلامیہ کی تربیت کا پہلا رکن توحید پر ایمان ہے

ملت بیضا تن وجاں لا الہ
ساز ما را پردہ گرداں لا الہ
لا الہ سرمایہ اسرار ما
رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

کیونکہ توحید کے درس سے پوری ملت ایک رشتہ وحدت میں پروئی جاتی ہے۔ اب ساری ملت کا مدعا و مآل' طرز انداز خیال ایک ہو جاتا ہے۔ اس سے ساری ملت یک زباں' یک دل اور یک جاں ہو جاتی ہے۔ تطہیر و تکمیل کے اس نظام میں بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ یاس و حزن کا ازالہ' سوال کی مخالفت' مساوات و اخوت بنی نوع آدم کا عقیدہ' آئین کی اطاعت' آرزو کی تربیت ------ اور سب سے آخر میں عشق اور ضبط نفس ------ تا آنکہ نیابت الٰہی تک پہنچ جاتا ہے"(۹)

اس عنوان کو میں ڈاکٹر سید عبد اللہ ہی کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"قصہ مختصر--- اقبال نے خودی و بے خودی کے مسئلے میں صوفیوں کے نظام فکر سے استفادہ تو کیا ہے مگر ان کا کارنامہ خاص یہ ہے کہ انہوں نے اس کو بھی اپنے خاص نظریہ اجتماعیت کے لئے استعمال کیا ہے اور صوفیوں کی فرد پسندی سے ذہن ہٹا کر اجتماعی عمل اور اجتماعی مصالح انسانیت کا راستہ دکھایا ہے۔ اور ازل پر نظر مرکوز کرنے کی بجائے ابد کی تسخیر کو منزل مقصود قرار دیا ہے اور اس تسخیر کے لئے

Scanned by CamScanner

جو دستور العمل تجویز کیا ہے اس میں فرد و اجتماع دونوں کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے(۱۰)

۸۔ ماخذ:- اقبال نے اپنے افکار کے سلسلے میں مشرق اور مغرب کے فلاسفہ سے اکتساب فیض کیا اور مختلف سرچشموں سے سیراب ہو کر ایک ایسا نظام فکر ترتیب دیا جس میں خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں ایک واضح اور مربوط نظریہ ملتا ہے۔ انہوں نے ایک طرف صوفیاء اور مذہبی مفکرین سے استفادہ کیا، دوسری طرف ماہرین نفسیات سے اکتساب علم کیا اور تیسری طرف سائنسی نقطہ ہائے نظر سے سوچ کی راہیں متعین کیں۔ یہ سہ طرفہ (Three dimentional) علم ان کے فلسفے کی تخلیق میں امتزاج کا باعث بنا اور ان کے یہاں توازن اور اعتدال کی خوبی پیدا ہوگئی ایسی خوبی جو دنیا کے بہت کم مفکرین میں نظر آتی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ اقبال نے قرآن اور حدیث کا مطالعہ گہری نظر سے ہی نہیں اجتہاد نظر سے بھی کیا یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دور حاضر میں جن لوگوں نے شعور کی پختگی کے ساتھ فکر اسلامی کے احیاء کی پرخلوص کوششیں کی ہیں ان میں اقبال پیش پیش ہیں۔ ایک لحاظ سے اقبال کا اولین مقصد صحیح اسلامی فکر کو حیات نو سے ہمکنار کرنا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فلاسفہ عالم کا مطالعہ کیا لیکن ان کے تمام افکار کو ایک نااندیش مقلد کی طرح نہیں اپنا لیا بلکہ ان کو چھان پھٹک اور ردو قبول کے ساتھ اپنایا۔ اچھے مال کو بڑی بولی دے کر بھی حاصل کر لیا اور ناقص مال کو مفت بھی قبول نہ کیا۔

مسلمان فلسفیوں میں دو گروہ رہے ہیں۔ ایک تو وہ جنہوں نے فلسفے کا مطالعہ فلسفے کی خاطر کیا۔ فلسفہ حقائق کی جستجو کا نام ہے چنانچہ اس گروہ نے حقائق کی جستجو کو اپنا شعار بنایا اور عقل کا وسیلہ اپنایا۔ اس گروہ میں یعقوب الکندی، الفارابی، بو علی سینا اور ابن رشد شامل ہیں۔ الکندی عرب فلسفی تھا جس نے سائنس اور مذہب دونوں کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا۔ اس کی تصنیفات کی تعداد دو سو پچاس بتائی جاتی ہے۔ اس کا خیال

Scanned by CamScanner

تھا کہ کائنات نے خدا کی ذات سے ظہور پایا اور وہ خدا کی بیکراں ذات کا ناگزیر بہاؤ ہے۔ اس کا نظریہ عقل بہت مشہور ہے۔ اسی طرح فارابی نے علت و معلول کے رشتے کو تسلیم کیا اور خدا کی ذات کو علت اولیٰ قرار دیا۔ اس نے عقلی نفسیات کی بات کی۔ بو علی سینا نے ذہن کی اقسام لکھیں۔ اس نے کہا دنیا میں عقل کی کار فرمائی ہے۔ اس نے منطق کی عظمت کو بھی تسلیم کیا۔ ابن رشد حکمائے اسلام میں وہ واحد فلسفی تھے۔ جنہوں نے کائنات کی تشریح و توجیہ خالصتاً" فلسفیانہ نقطہ نظر سے کی۔ یہ عظیم فلسفی یورپ کے حواس پر چھایا رہا۔

ان عقلی فسلفیوں کے بعد دوسرا گروہ متکلمین کا تھا جو منطق اور فلسفے کا مطالعہ اس مقصد کے تحت کرتے تھے کہ دینی علوم کو فسلفیانہ علوم کی روشنی میں ترویج دے سکیں۔ ان کے بھی آگے دو گروہ بن گئے۔ ایک تو وہ جن کا رجحان عقل کی طرف تھا اور دوسرا جن کا رجحان وجدان کی طرف تھا۔ پھر ایک قسم کے لوگ معتزلہ کہلائے جن کے رہنماؤں میں واصل بن عطا' النظام' عبدالوہاب جبائی قابل ذکر ہیں' معتزلہ توحید کو اس حد تک مانتے تھے کہ خدا کی صفات کو بھی اس میں شامل نہ کرتے تھے اور قرآن کو قدیم نہیں حادث سمجھتے تھے۔ خلق قرآن کا مسئلہ سب سے پہلے معتزلہ نے اٹھایا۔ اسی طرح وہ کہتے تھے کہ انسان کے افعال اختیاری ہوتے ہیں تقدیری نہیں۔ خدا کو دیکھا نہیں جاسکتا۔

اقبال عقلی فلسفیوں سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتے۔ تاہم معتزلہ کے بعض خیالات سے متفق نظر آئے ہیں یعنی تقدیر' اختیار اور رویت باری کے سلسلے میں۔ دوسرا گروہ اشاعرہ کا تھا جو رویت باری کے قائل' تقدیر پرست اور قرآن کے قدیم ہونے کا تصور رکھتے ہیں۔ اسی گروہ میں ابو الحسن اشعری 'غزالی اور رازی وغیرہ شامل ہیں۔ اقبال رویت باری اور تقدیر کے مسئلے میں ان سے متفق نہیں ہیں۔ غزالی نے دو نتائج غور و فکر کے بعد نکالے۔

(۱) منطق اور فلسفہ پڑھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

(۴) حقیقت مطلق تک رسائی کے لئے واحد ذریعہ وجدان اور ایمان ہے۔ ان کے نزدیک عاقل حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی۔

اقبال اور ان مفکرین اور خصوصاً صوفیاء کا مقام اتصال یہی ہے کہ حقیقت کا ادراک وجدان کے ذریعے ہو سکتا ہے عقل کے ذریعے نہیں۔ اسی طرح ان کے خیال میں علم حقیقی کا ادراک بھی وجدان کے ذریعے ممکن ہے۔ انسانی شرف اور فضیلت کے سلسلے میں بھی دونوں میں ایک حد تک اتفاق ہے۔ ہر چند کہ صوفی مادے کو نجات کے راستے میں رکاوٹ مانتے ہیں بلکہ اقبال ارتقائے خودی کے لئے موانعات کو لازمی تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح مسئلہ عشق کی تعبیر و تشریح میں بھی ایک حد تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں البتہ بعد میں دونوں کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں لیکن اس خیال میں کہ عشق علم پر فضیلت رکھتا ہے دونوں متفق ہیں لیکن ان مفکرین، صوفیاء اور اقبال کے درمیان سب سے بڑا اختلافی مسئلہ نظریہ خودی ہے۔ صوفی "خود" کو محبوب حقیقی کے راستے میں حقیقت کی حصول تک رسائی کے لئے رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ خود کی نفی کئے بغیر حقیقت مطلق تک نہیں پہنچا جا سکتا ہے۔ اقبال اس فلسفے کے برعکس ارتقائے حیات کے لئے شرط اولین خودی کے اثبات کو سمجھتے ہیں۔

اسی طرح مادے کی بحث میں صوفیاء مادہ کے دشمن ہیں۔ جبکہ اقبال مادے کو حقیقت تسلیم کرتے ہیں وہ اس کائنات کی حقیقت کے قائل ہیں اور اس بات کا سبق دیتے ہیں کہ مادے کو تسخیر کرنا ضروری ہے۔ مزید برآں انسان کا شرف صوفیوں کے نزدیک اس کی روحانی ترقیوں کا نتیجہ ہے لیکن اقبال مادہ اور روح دونوں کا امتزاج انسان میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

چوتھی پانچویں صدی ہجری میں نظامی عروضی اور اس سے پہلے بو علی سینا مسئلہ ارتقاء پر بحث کر چکے تھے لیکن ان کا ارتقاء وہی روحانی اور زیادہ سے زیادہ مادی عوارض سے الگ ہوتا تھا۔ اقبال بیک وقت حیاتیاتی (Biological) تصور بھی رکھتے ہیں اور روحانی بھی۔ ارتقاء کی آخری حدول کے سلسلے میں بھی اقبال اور صوفیاء میں اختلاف

ہے۔ صوفی ارتقاء کی آخری منزل یہ سمجھتے ہیں کہ انسان روحانی ترقی کرتے کرتے خدا میں مدغم ہو جائے۔ غالب نے صوفیاء کے اس نظریے کو اس طرح پیش کیا ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

لیکن اقبال کے یہاں وصال کا تصور نہیں ہے کیونکہ وصل میں مرگ آرزو ہے۔

مشرقی اور اسلامی مفکرین میں سب سے زیادہ اقبال مولانا جلال الدین رومی سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

دونوں عشق کو عقل پر اہمیت دیتے ہیں۔ دونوں اثبات خودی کے قائل ہیں۔ دونوں تقدیر کے جبر کو نہیں اختیار کو تسلیم کرتے ہیں۔ دونوں ارتقاء کے قائل ہیں۔ دل و نظر کی تربیت، اپنی ذات کے عرفان اور کائنات کی حقیقت و ماہیت کے ادراک کے بعد انسان مداج اعلیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ رومی کے یہاں انسانی ارتقاء کا قرآنی اور سائنسی نظریہ پایا جاتا ہے۔ وہ جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوانیات اور حیوانیات سے انسانیات کے ارتقاء کو تسلیم کرتے ہیں۔ اقبال بھی خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو پر یقین رکھتے ہیں۔ دونوں مفکرین کا نصب العین انسانی ہے۔ دونوں جہد مسلسل اور حرکت و تڑپ کو زندگی، اور سکون و بے عملی کو موت تصور کرتے ہیں۔ دونوں کے یہاں بقاء سعی اور پیہم عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خودی کی پشت پر ایک ایسی قوت محرکہ کا ہونا ضروری ہے جو اسے تمام مراحل سے بخوبی اور بہ سلامت گزار دے۔ رومی اور اقبال دونوں کے نزدیک یہ قوت محرکہ عشق ہے۔ عشق دراصل ایک ذوق وجدان اور جذبہ تسخیر ہے جو خودی اور کائنات سے ہم رنگ ہے۔ یہاں تک کہ اقبال کے نزدیک عشق اصل حیات ہے۔

عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات

عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

جہاں تک فلاسفہ مغرب کے اثرات کا تعلق ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے افلاطون کا ذکر آتا ہے۔ اقبال نے افلاطون کے نظریات کا مطالعہ کیا لیکن اس کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ افلاطون تعلیم میں پر فیکشن (Perfection) کا قائل تھا۔ وہ سیرت کا مکمل ارتقاء چاہتا تھا۔ وہ روحانی اور اخلاقی اقدار کو مادی اقدار کے ساتھ ہم قدم دیکھنا چاہتا تھا۔ اقبال ان معاملات میں افلاطون کا ہم خیال ہے۔ صرف زندگی کی حقیقت کے بارے میں دونوں میں اختلاف ہے کیونکہ افلاطون اس زندگی اور دنیا کو اصل نہیں سمجھتا بلکہ اس کو عالم مثال کا عکس تصور کرتا ہے۔ جبکہ اقبال زندگی کو ایک ٹھوس حقیقت اور دنیا کے معاملات کو نہایت اہم سمجھتے ہیں۔ افلاطون پر تنقید اسی بنا پر ہے۔

راہب دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہ گوسفنداں قدیم
رخش او در ظلمت معقول گم
در کہستان وجود افگندہ سم
آنچناں افسون نامحسوس خورد
اعتبار از دست و چشم و گوش برد
عقل خود را بر سر گردوں رساند
عالم اسباب را افسانہ خواند
منکر ہنگامہ موجود گشت
خالق اعیان نا مشہود گشت
قوم از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوق عمل محروم گشت

Scanned by CamScanner

اقبال اپنے نظریات کے اعتبار سے افلاطون سے زیادہ ارسطو کے قریب تھا کیونکہ ارسطو کا ذہن مشاہداتی اور تجزیاتی قسم کا تھا۔ اور یہی خوبی اقبال کے یہاں موجود ہے۔ اسی طرح اقبال بعد کے بہت سے فلسفیوں سے متاثر ہوئے۔ ڈیکارٹ وہ پہلا آدمی ہے جس نے مادے کو ایک مستقل حیثیت دی اور مادی حقیقتوں کے ادارک کے لیے عقل کی رہنمائی کو تسلیم کیا۔ سترہویں صدی کے اس فرانسیسی فلسفی اور ریاضی دان نے کہا فضا خالی شے نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز موجود ہوتی ہے کیونکہ اگر فضا خالی رہ جائے تو یہ خالق عالم کے کمال کے منافی ہوگا کیونکہ دنیا کی کوئی شے بے مقصد نہیں۔ بقول غالب

یک ذرہ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

اقبال بھی اسی خیال کے حامل ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

برکلے نے مادے اور روح کے امتزاج پر زور دیا۔ ظاہر ہے اقبال بھی اسی نظریے کے حامل ہیں۔ اسی طرح نیوٹن نے کہا مطلق وقت کسی تقسیم کے بغیر بہتا ہے۔ اس کے بہاؤ میں تبدیلی پیدا کرنا ممکن نہیں۔ ہم اپنی سہولت کے لیے اسے ماہ و سال میں تقسیم کرلیتے

Scanned by CamScanner

ا یعنی وہ بذات خود یکساں طور پر بہتا ہے۔ اقبال بھی نظریہ زمان و مکان میں اسی بات
کے قائل نظر آتے ہیں۔ان کے خیال کے مطابق حقیقی زماں ایک قسم کی تخلیقی فعلیت
ہے جس کو برگسان---- Pure Duration اور ابن سینا "السرمدیان" کہتا ہے۔
اس کو ابدیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقی زمان ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم
نہیں کی جاسکتا۔ البتہ اس زمان حقیقی کا ایک خارجی مظہر روز و شب کا تسلسل ہے۔ یہی
سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات بھی ہے اور اصل حیات و ممات بھی، اسی کے حوالے
سے ذات کی جلوہ گری صفات کے آئینے میں ہوتی ہے۔ ورنہ بقول اقبال

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

برگساں نے کہا تغیر و حرکت ہی اصل حقیقت ہیں جس سے ہمیں زماں کا احساس ہوتا ہے۔
فعلیت کو ظہور افعال سے پہلے ان کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے ظہور میں کسی مشیت
کا دخل ہوتا ہے لیکن پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے الفاظ میں "اس کے برخلاف اقبال
کے ہاں تغیر و حرکت فعلیت مطلقہ کی شان ہے۔ فعلیت مطلقہ مبہم اور بے مقصد نہیں
بلکہ مقصد اور شعور و ارادہ سے متصف ہے۔ (اقبال کی تیرہ نظمیں)
نیوٹن نے یہ بھی کہا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے قانون قدرت کے تحت ہو رہا ہے۔ بعد
میں کچھ مفکرین نے اس کو بنیاد بنا کر نیچرلزم کی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اسی تحریک کے رد
عمل کے طور پر انسان دوستی کی تحریک یعنی ہیومنزم کی تحریک وجود میں آئی۔ انہوں نے
اپنے افکار کی بنیاد انسان اور اس کے مسائل پر رکھی۔
شوپن ہار کے فلسفے نے بھی دنیا کو بہت متاثر کیا۔ وہ قنوطی فلسفی تھا۔ اس نے ارادے کو
اصل حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اسی کو ہر چیز کا خالق قرار دیا۔ اس کے خیال میں زندگی
زندہ رہنے کا جبلی ارادہ ہے لیکن ارادہ اندھا ہے۔ اس نے زندگی کے مصائب اور آلام

Scanned by CamScanner

کو خودکشی کا جواز ملا لیکن اقبال کے نزدیک دنیا کے مصائب و شدائد ہی خودی کی تربیت اور اصلاح کا موجب بنتے ہیں۔ پھر اقبال شوپن ہار کے برعکس رجائی فلسفی ہیں۔

اسی طرح پروفیسر آئن شائن کے نظریہ اضافیت نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ اقبال نے پیام مشرق میں ایک نظم بعنوان "حکیم آئن شائن" اس کی تعریف میں لکھی ہے۔ آئن شائن نے سائنسی نقطہ نظر سے ثابت کیا کہ وقت مطلق نہیں ایک اضافی چیز ہے۔ ہر مشاہد کا ایک ذاتی وقت ہوتا ہے۔ آئن شائن نے یہ بھی ثابت کیا کہ توانائی بھی وجود رکھتی ہے۔ بلکہ اس نے مادہ اور توانائی کو ایک ہی شے کی دو مختلف شکلیں قرار دیا جس طرح برف اور پانی ایک ہی شے کی دو مختلف حالتیں ہیں۔ مادہ پرستوں کا خدا کی ہستی کے خلاف یہ استدلال تھا کہ ایک غیر مادی خالق، مادی اشیاء کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے لیکن آئن شائن کے نظریے نے ثابت کردیا کہ مادے اور توانائی میں بنیادی فرق نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ

"اللہ نور السماوات والارض"

(یعنی خدا آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے)۔ نظریہ اضافیت نے یہ بھی ثابت کیا کہ کائنات لامتناہی نہیں بلکہ متناہی ہے یعنی اگر ہم کائنات میں چلنا شروع کردیں تو نقطہ آغاز پر پہنچ جائیں گے (کائنات کے گول ہونے کی وجہ سے)۔۔۔ اقبال نظریہ اضافیت کے اس حد تک تو قائل ہیں کہ جسم اور روح ایک وحدت ہے جس طرح نظریہ اضافیت میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے ہی حقیقت کے دو روپ ہیں اسی طرح مادہ اور روح بھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں البتہ اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ نظریہ اضافیت نے وقت کی اضافیت کو ثابت کرکے وقت کی حقیقت اور واقعیت کو فنا کردیا ہے۔ اس طرح زماں کی تخلیقی حرکت باقی نہیں رہی۔

نطشے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس نے دائمی تکرار کا نظریہ پیش کیا یعنی اس کے خیال کے مطابق ہر واقعہ اپنے آپ کو دوسری ترتیب میں بار بار دھراتا ہے۔ جو آج ہو رہا ہے وہ ماضی میں کئی بار ہوچکا ہے اور آئندہ بھی کئی بار ہوگا۔ اقبال نطشے کے اس تصور کو میکانکی

Scanned by CamScanner

سمجھتے ہیں اور جبرت قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں واقعات کا اس طرح بار بار تکرار ہائے دوام کو ناقابل برداشت بنا دیتا ہے۔ ہماری جدوجہد اور سعی نئی اور انوکھی شے کیلئے ہوتی ہے جبکہ نطشے کے نزدیک نئی شے تو ظہور میں آہی نہیں سکتی۔ اقبال ہر وقت جہانے تازہ اور امتحانے تازہ کی تلاش میں ہیں۔

یا جہانے تازہ یا امتحانے تازہ

می کنی .تاچند باما آنچہ کردی پیش ازیں

اسی طرح " زمانہ " کا ایک مصرعہ ہے۔

جو تھا نہیں ہے 'جو ہے نہ ہوگا' یہی ہے اک حرف محرمانہ

کارل مارکس کا معاشی نظریہ بھی دور جدید کا پرزور نظریہ ثابت ہوا۔ اس نے انسانی اجتماع کو طبقات میں تقسیم کیا اور کہا کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے سے دار و گیر کے بعد اس پر قابض ہوتا ہے۔ اس نے مادی جدلیات کا فلسفہ پیش کیا۔ اقبال نے مارکس کے جدلیاتی فلسفے (حرکت اور کشمکش) اقتصادی نظام اور رجائی نقطہ نظر کی تحسین کی۔ لیکن اس کے لادینی اور محض مادی فلسفے کی مخالفت کی۔ اشتراکیت کے بارے میں اقبال کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے صحیح لکھا ہے کہ۔

"کلام اقبال کے اس حصے کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی بالعموم تین صورتیں نظر آئیں گی ۔ پہلی صورت میں ایک اہم عالمی واقعہ کے طور پر اشتراکی انقلاب روس کا تذکرہ ہے ۔ اور یہ مشرق کے پسماندہ و محکوم ممالک کا قدرتی رد عمل ہے جو حیرت ومسرت کے ملے جلے جذبات کا حامل ہے ۔دوسری صورت میں اشتراکی نظام کو مغرب کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام اور اس کے استعماری کردار کا قدرتی شاخسانہ قرار دے کر اس کی تحسین کی گئی ہے ۔ تیسری صورت میں اقبال نے اشتراکی نظام کے مقابلے میں اسلام کے نظام عدل واحسان 'معاشی انصاف اور اخوت ومساوات کو پیش کر کے اول الذکر پر اس کی برتری ثابت کی ہے" (۱۱)

غرض اقبال نے ان تمام فلاسفہ عالم کے نظریات کو پڑھا۔ ان کے اثرات قبول کئے اور

ان پر تنقید بھی کی ۔ دراصل اقبال نے ہر فلسفے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا اور پرکھا۔ اچھی چیز لے لی اور منفی پہلو کو نظر انداز کر دیا ۔ اس طرح اقبال کا فلسفہ ان صحت مند نظریات کا مجموعہ بن گیا جو مختلف فلسفیوں کے درمیان ہمیں بکھرے ہوئے ملتے ہیں ۔ اقبال کا یہ فلسفہ "تصور خودی" کے نام سے موسوم ہے جو زمانے کے تناظر' اپنے مفہوم و مطالب اور اپنے نتائج کے اعتبار سے پوری انسانیت کے لیے مفید ہے ۔ اس خودی کی نمو جب انسانوں میں ہوتی ہے تو اقبال کے آئیڈیل افراد پیدا ہوتے ہیں جن کے اجتماع سے ایک مثالی سوسائٹی جنم لیتی ہے۔ اسی لئے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اقبال نے جس کامل سوسائٹی کا تصور پیش کیا وہ حد درجہ فعال' باعمل اور درد مند سوسائٹی ہے ۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ پاکستان بننے کا بعد بھی یہ مثالی سوسائٹی وجود میں نہ آ سکی۔ ہمارے یہاں کے جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام نے ان امکانات کو ہمیشہ معدوم کئے رکھا جو مثالی معاشرے کے قیام کا باعث بن سکتے تھے۔ ہوس زر اور ہوس اقتدار نے خود غرضی' نفسانفسی ' استحصال اور منافقت کو جنم دیا ۔ آج ہمارا معاشرہ زوال کی انتہائی حدوں کو چھو رہا ہے۔ رشوت' سفارش' بے ایمانی' جھوٹ' منافقت اور ہر نوع کی کرپشن اپنے عروج پر ہے۔ کسی میں خلوص نہیں' قوم اور ملک کا درد نہیں۔ ہر طرف لوٹ مچی ہوئی ہے۔ ذات پات کی تمیز' ادنی اور اعلی کا تصور' اور امیر غریب کا فرق عام ہے۔ رواداری' خلوص و محبت اور مروت و شرافت کے اعلی جذبے مفقود ہو چکے ہیں۔ معاشرے میں دولت کو بالادستی حاصل ہے۔ لیاقت' قابلیت' ذہانت اور شرافت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ مارشلاؤں' غیر جمہوری حکومتوں' اور بیوروکریسی کی طاقت نے آزادی کا تصور ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ کوئی انسان مطمئن نہیں۔ جس معاشرے میں جان و مال اور عزت کا تحفظ نہ ہو۔ جہاں سوشل جسٹس کا نام نہ ہو۔ جہاں قانون اور دستور پر عمل نہ ہو اسے کس طرح اقبال کے خواب کی تعبیر قرار دیا جا سکتا ہے ؟

اقبال کی روح یقیناً" افسوس میں ہوگی کہ جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ پاکستان بننے کی بعد بھی شرمندہ تعبیر ہی رہا۔ کاش ہماری نوجوان نسل ہی اقبال کے پیغام کو سمجھ سکتی کہ خود

Scanned by CamScanner

اقبال کی واحد امید یہی نوجوان تھے۔

حوالہ جات

۱۔ "اقبال ایک مطالعہ" ص ۱۳۲، مطبوعہ اقبال اکادمی طبع اول ۱۹۸۷ء

۲۔ البتہ عالم اسلام میں ترک واحد بہادر قوم تھی جس نے شکست کے باوجود ہمت نہ ہاری، غازی مصطفیٰ کمال اتاترک کی سرگردگی میں ترک فوجوں نے یونانیوں کو شکست فاش دی اور پھر ۱۹۲۲ء میں نہ صرف یونانیوں کو بلکہ اتحادی فوجوں کو بھی استنبول سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ مزید تفصیل کے لئے اسی کتاب میں "اقبال اور ترکمان سخت کوش" ملاحظہ فرمائیں)

۳۔ "بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ" ص ۲۴، مطبوعہ یونیورسل بکس ۱۹۸۷ء

۴۔ "ترجمان اسرار" از جسٹس عبدالرحمن ص ۳۳، مطبوعہ مکتبہ کارواں لاہور

۵۔ ---ایضاً"--- ص ۳۵

۶۔ ---ایضاً"--- ص ۳۷-۳۸

۷۔ "اقبال کے فکری آئینے" مرتبہ حسن رضوی ص ۲۳۷

۸۔ ---ایضاً"--- ص ۹۴

۹۔ ----ایضاً"---- ص ۹۷

۱۰۔ ---ایضاً"---- ص ۹۸

۱۱۔ "اقبال --- ایک مطالعہ" ص ۱۱۰

Scanned by CamScanner

اقبال کا شعور انقلاب

اقبال ایک نگاہ دور رس رکھتے تھے۔ جس نے قوموں کے عروج و زوال کو دیکھا اور پرکھا۔ حالات کا تجزیہ معروضی نقطہ نظر سے کیا۔ مطالعے کی وسعت سے اقبال نے اپنے اس شعور کو جلا دی۔ اور ایسے تصورات پیش کئے۔ جو ترقی پسندانہ تھے۔ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے چونکا دینے والے بھی' یہ وہ خیالات ہیں جن کو خوف فساد خلق سے یا تو چھپایا گیا اور یا "ناگفتہ" رہنے دیا گیا۔ اقبال کو زیادہ سے زیادہ یہ کریڈٹ دیا گیا کہ وہ ایک مذہبی شاعر ہیں۔ اسلامی شاعر ہیں۔ روحانیت اور مابعد الطبیعات سے تعلق رکھنے والے مسائل کے شاعر ہیں۔ اقبال شناسوں نے اپنی توجہ زیادہ تر انہی پہلوؤں پر مرکوز کئے رکھی۔ لیکن یہ بات دانستہ طور پر فراموش کی گئی کہ اقبال معروضی رویوں کے شاعر ہیں۔ ارضی تقاضوں کو سامنے رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ انقلاب کے داعی ہیں۔ ایک ایسے انقلاب کے جو قوت اور توانائی سے بھرپور ہے۔ ان کے یہاں انقلاب ایک ڈائنامک فورس بن کر ابھرتا ہے۔ یہاں تک کہ اقبال کا مثالی انسان عبدالکریم الجیلی کے مرد کامل کی طرح محض الہیات اور روحانیت کے اعلی مدراج طے نہیں کرتا۔ بلکہ سامنے کی دنیا اور معروضی حالات (Objective Conditions) کو اولیت دیتا ہے۔

Scanned by CamScanner

اقبال زندگی کی مثبت قدروں کے شاعر ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے فعال عناصر سے روشنی حاصل کرکے حال کو توانائی بخشی اور مستقبل کے صحت مند اور ترقی پسندانہ رویوں کا واضح تصور پیش کیا۔ انہوں نے جس کامل سوسائٹی کا تصور دیا وہ نہ تو محدود ہے اور نہ تنگ نظر، بلکہ اس کی ماہیت لامحدود اور لامتناہی ہے۔ اس مثالی جماعت کے یہاں رنگ و نسل، ذات پات، طبقاتی تقسیم، اور تعصب بے معنی الفاظ ہیں۔ اس لئے کہ اس کا مقصد بنی نوع انسان کو رشتہ وحدت میں پرونا ہے۔ اقبال کے کلام کا فکری پس منظر انسانی سوسائٹی کا زوال اور عروج آدم کی آرزو اور خواہش کا اظہار ہے۔ ان کے عظیم سماجی اور عمرانی خیالات، صحت مند تہذیبی رویے، رجائی نقطہ نظر اور حسن بیان نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا۔

دراصل بات یہ ہے کہ فن کار کی تخلیقات ان تاثرات کی آئینہ داری کرتی ہیں جو سماجی ماحول اور معاشرے سے جنم لیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری، فن و ادب کے بارے میں ان کے تصورات اور ان کے فکریاتی نظام کی تشکیل و تعمیر میں ان معاشرتی کوائف نے حصہ لیا جو ان کے زمانے میں موجود تھے۔ اقبال کا زمانہ سماج کی تاریخی تقسیم کے تحت نیم جاگیرداری اور نیم سرمایہ داری نظام کہلانے کا مستحق ہے۔ جب ہمارے یہاں زوال اور انحطاط اپنی آخری حدود کو چھو رہا تھا۔ لیکن ظاہر ہے ہر زوال ایک نئے زمانے کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر عروج ایک زوال کا نقیب ہوتا ہے۔ اقبال کے دور میں وہ قوتیں بھی ابھرنا شروع ہو گئیں۔ جو بیداری کی علامت تھیں۔ اقبال نے بیداری میں اپنا رول ادا کیا۔ انہوں نے اپنے پیغام کو شاعری کے رنگ و روپ میں پیش کرکے ضمیر آدم کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔

چنانچہ اقبال اس دور کے معروضی رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہر قسم کے استحصال، جبر اور ظلم کی شدید مخالفت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے

Scanned by CamScanner

موجودہ نظام سے غیر مطمئن ہو کر "جہان دگر" کی خواہش کا اظہار برملا کیا ہے۔ اور اس جہان نو کا خالق غریب اور مزدور کو قرار دیا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے ہر اس تہذیب اور نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی تلقین کی جو استحصال اور جبر کو جنم دیتا ہو۔ انہوں نے نسل قومیت کلیسا' سلطنت تہذیب' اور رنگ کو خواجگی' یعنی سرمایہ داری کے بنائے ہوئے "مسکرات" کہہ کر پکارا ہے۔ جن کی مدد سے غریب عوام کی فکر کو مفلوج کیا گیا۔ خواجگی کے نظریے کے مطابق کچھ لوگ فطری طور پر کمتر درجے کے ہوتے ہیں تو کچھ برتر' کچھ حاکم ہوتے ہیں۔ تو کچھ محکوم' کچھ آمر ہوتے ہیں تو کچھ مامور۔ لیکن اقبال اس تفریق کو جو مصنوعی ہے' پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے جابجا رنگ و نسل کے امتیاز کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔

اسی طرح قومیت کے نظریئے نے بھی غریب کا استحصال کرنے میں مدد دی۔ قومیت کے تصور کو دیوتا کی حیثیت دے دی گئی۔ اس طرح قومی عصبیت وجود میں آئی۔ کلیسا نے غریب کو فردوس ارضی سے محروم کرنے کی خاطر اس کو یہ تصور دیا کہ دوسری دنیا میں اس کے لئے ابدی زندگی ہے۔ اور امیر لوگ اس دنیا میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے اس جنت میں داخل ہونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کا گزرنا۔ اس تصور کا مقصد غریب کے احساس محرومی کو کم کرنا تھا تاکہ وہ اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہ کرے۔

اسی طرح اقبال نے ایک نشہ سلطنت کو قرار دیا۔ کیونکہ سلطنت کی توسیع کی ہوس نے نو آبادیاتی نظام کو جنم دیا اور یوں سرمایہ داری نظام کے استحصال کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔ پھر ایک نشہ تہذیب کا ہے۔ کیونکہ تہذیب کا دائرہ مخصوص مراعات یافتہ طبقے کی تہذیب تک محدود ہو کر رہ گیا ہے طبقاتی تہذیب معاشرے میں طبقاتی ناہمواری کا باعث بن کر رہ گئی۔ ایک طرف تو سماجی روابط اس سے متاثر ہوئے اور دوسری طرف استحصالی اقدار وجود میں آئیں۔

"خضر راہ" میں سرمایہ و محنت کے عنوان کے تحت اقبال نے اپنے انہی

Scanned by CamScanner

خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل قومیت 'کلیسا' سلطنت ' تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات

اقبال کے یہ خیالات حقیقت پر مبنی ہیں اور روسی انقلاب ۱۹۱۷ء کے اثر کا نتیجہ ہیں کیونکہ بقول پروفیسر محمد عثمان مرحوم "نظم خضر راہ میں روس یا روسی انقلاب کے الفاظ کھلم کھلا استعمال نہیں ہوئے۔ لیکن قرائن اس قدر غیر مبہم ہیں کہ کوئی سخن فہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ اشعار انقلاب روس سے تعلق رکھتے ہیں۔"

(حیات اقبال کا ایک جذباتی دور ۵۸)

عزیز احمد کا بھی یہی خیال ہے کہ "خضر راہ سے پہلے طبقاتی کشمکش ' معاشی آزادی اور دوسرے اشتراکی مسئلوں کا ذکر اقبال کے کلام میں شاذ و نادر ہی کہیں ہوا ہو ...... خضر راہ میں سب سے پہلے اسلام اور اشتراکت کا امتزاج ملتا ہے۔ اشتراکیت کے تجزیے تک وہ تو غالباً" مارکس کے نقطہ نظر سے پہنچے ہیں۔ لیکن خضر کی زبانی ان حقائق کا بیان کرنا اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ اسلام کا اجتہاد بھی ان معاشی تجزیوں کی پوری تائید کرتا ہے۔" (اقبال .... نئی تشکیل ۱۵۸)

Scanned by CamScanner

چنانچہ اقبال موجود نظام کے ان استحصالی عناصر کے خاتمے کی خاطر انقلاب کی بات کرتے ہیں۔ ایسے انقلاب کی جو کھوکھلے اور فرسودہ نظام کو ڈھاوے جو کاخِ امراء کے لئے سیلاب بن جائے اور مزدور کے دور کا آغاز کرے۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال زندگی کی نمود کو مادی اور ارضی رشتوں کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا انقلابی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں جس میں انسان تسخیر فطرت کرے۔ مادی مسائل کو بلا امتیاز سوسائٹی کے تصرف میں لائے۔ اس کے راستے میں استحصالی قوتیں حائل نہ ہو سکیں۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی کو قائم دیکھنا چاہتے تھے جو "احترام آدمیت" کی بنیادوں پر استوار ہو۔ جہاں انسان انسان کی تذلیل نہ کر سکے۔ جہاں آدم قاتل آدم نہ بن سکے۔ چنانچہ اس "جہاں دگر" کا پیام انہوں نے اس طرح دیا۔

کوہ کن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرت خواجگی و محنت لالائی رفت
راز ہائے کہ نہاں بود بباز ار افتاد
آن سخن سازی و آں انجمن آرائی رفت
چشم بکشائی اگر چشم تو صاحب نظراست
زندگی در پے تعمیر جہاں دگراست

(پیام مشرق (۱۹۱)

یہ جہاں دگر اقبال کا مثالی معاشرہ ہے۔ جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہے۔ پیام مشرق میں ہیگل کی زبان سے خواجہ و مزدور اور آمر و مامور کے درمیان لذت پیکار کی بات یوں کرتے ہیں۔

فطرت اضداد خیز لذت پیکار داد

Scanned by CamScanner

خواجہ و مزدور را آمر و مامور را

ٹالسٹائی کے ذریعے تاج، کلیسا اور وطن کو "دارو ئے بے ہوشی" قرار دیا ہے۔ اور خواجہ کے استحصال کا ذکر تلخی سے کیا ہے۔

مزدور کے عنوان کے تحت دور پرویزی کے گزرنے کا مژدہ سناتے ہوئے مزدور کو جنت گم گشتہ پرویز سے چھین لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ پیام مشرق ہی میں انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے جمہور کے ہاتھوں ردائے پیر کلیسا اور قبائے سلطان کو تار تار کرواتے ہیں

بے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن
مثال دانہ تہہ سنگ آسیا بودست
غلام گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر
قمیص خواجہ کہ رنگیں زخون ما بودست
شرار آتش جمہور کہنہ سامان سوخت
ردائے پیر کلیسا، قبائے سلطان سوخت

(پیام مشرق صفحہ ۲۰۹)

ہر نظام ایک خاص نقطہ عروج پر پہنچ کر زوال آمادہ بھی ہوتا ہے۔ نظام خواجگی کے مقدر میں بھی زوال اور انحطاط لکھا جا چکا ہے۔ اس ٹوٹتے ہوئے نظام کی بوسیدہ دیوار کو گرانے کا کام مزدور کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔

بیا کہ تازہ نوائی تراود از رگ ساز
مے کہ شیشہ گداز بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغان رانظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
بطوف شمع چو پروانہ زیستن تاکے
زخویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تاکے

(پیام مشرق صفحہ ۲۱۶)

Scanned by CamScanner

گویا اقبال مزدور کو خواجہ کا دست نگر اور محتاج دیکھنا پسند نہیں کرتے بلکہ اسے اپنی قوت اور خودی کے بل بوتے پر " رہزنان چمن " سے انتقام لینے اور انقلاب برپا کرنے کا درس دیتے ہیں۔ اقبال کا نظریہ انقلاب عصائے کلیمی کا حامل ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دنیا کے ہر نظریے کی ترویج ایک حد تک طاقت کی منت کش ضرور رہی ہے۔ اقبال گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفے کے قائل نہ تھے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ان کے نزدیک حق چھینا جاتا ہے۔ ہاتھ پھیلا کر مانگا نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طاقت کے پرستار ہیں۔ میسولینی جیسے فسطائی کے اندر طاقت کے استعمال کی صلاحیت دیکھ کر اس کے اس پہلو کو بنظر تحسین دیکھتے ہیں۔ اقبال کا نظریہ انقلاب طاقت کے زور سے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن اس طاقت میں وہی شعور ہے۔ جو ان کے نظریہ عشق میں ہے۔ یہ اندھی طاقت نہیں آنکھیں رکھنے والی طاقت ہے۔ اقبال معروضی حالت سے ربط رکھتے ہیں۔ ان کو سمجھنے کے اہل ہیں۔ وہ اس لئے انقلاب چاہتے ہیں۔ کہ

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
ازجفائے دہ خدایاں ' کشت دہقاناں خراب
انقلاب ' انقلاب ' اے انقلاب

اب سوال یہ ہے کہ اقبال کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر پاکستان کی صورت میں سامنے آنے کے باوجود کون سی قوتیں ہیں جو اس انقلاب اور مثالی معاشرے کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ جن کی آرزو علامہ اقبال کے دل میں تھی۔

اقبال کا نظریہ خیر و شر

علامہ اقبال کے کلام میں شیطان کا وجود خیر و شر کے مسئلے کو سامنے لاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد خان خیال کے الفاظ ہیں "فکر اقبال نے شیطان کو ایسی عظمت و شوکت بخش دی ہے کہ وہ تخلیق انسان کے آفاقی ڈرامے کا بدنصیب ہیرو نظر آتا ہے۔ اقبال نے اس مسئلے پر خالص علمی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے غور کیا اور اپنے نتائج فکر کو حسب معمول شعریت کا آب و رنگ دے کر موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔"(۱) حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے یہاں ابلیس کا تصور ان کے فلسفہ خودی کا لازمی جزو ہے۔ وہ خودی کی تکمیل کے لئے شر کو ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے عام تصورات مذہبی یا معاشرتی میں شیطان کو مردود قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اقبال اسے انسانی زندگی کا زبردست محرک سمجھتے ہیں۔ ابلیس جو شر کا نمائندہ ہے۔ خودی کو ضعیف کر دیتا ہے اور خودی کو اپنی طاقت اور بقاء کے لئے اس سے لڑنا پڑتا ہے۔ کیونکہ خودی کی تقویت کے لئے جدل و پیکار ضروری ہے۔ جب دو خودیاں باہم ٹکراتی ہیں تو طاقت ور خودی غالب آجاتی ہے۔ اور کمزور یونٹ مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گویا خودی کی آزمائش کے لئے مسابقت جاری رہتی ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ خودی کی جان نظریہ عشق ہے۔ عشق کی ماہیت آرزو ، جستجو اور اضطراب ہے۔ اگر زندگی میں شیطانی قوتیں موانع پیدا نہ کریں تو نہ صرف خیر کوشی ختم ہو جائے کہ جس کی بدولت خودی میں بیداری اور استواری پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ حصول مقاصد کے لئے جستجو اور اضطراب کا جذبہ بھی مرجائے۔

اقبال بنیادی طور پر جدوجہد کے مبلغ ہیں۔ اور جدو جہد باطنی اور خارجی مزاحمتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انسان کا کام عناصر فطرت اور کائنات کی تسخیر ہے۔ لیکن تسخیر کی راہ میں مزاحم قوتیں (شیطانی قوتیں) نہ ہوتیں تو ارتقائے حیات ممکن نہ تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں " شیطان کائنات میں بھی کارفرما ہے۔ اور ہر شعبہ حیات میں بھی اور انسان کے جسم میں بھی ہے۔ اس کے تصور میں بھی اور

تحت الشعور میں بھی- وہ حرکت اور تخلیق کا مصدر ہے-"(۲) چونکہ ابلیس خودی کی ترقی اور تقویت کا وسیلہ ہے- اس لئے اقبال اس کو نمائندہ شر نہیں سمجھتے - بلکہ خیر ہی کا ایک حصہ تصور کرتے ہیں- دراصل فطرت کے بعض سلسلہ ہائے عمل بظاہر تشدد اور ظلم کے مظاہر معلوم ہوتے ہیں- جیسے کہ کہا گیا ہے "فطرت ظالم ہے" (Nature is Cruel) لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی زندگی نیچر کی رکاوٹوں کی وجہ سے آگے بڑھتی ہے- ارتقاء کی تمام منازل طے کرنے کا عمل شر اور رکاوٹوں سے گزرنے کا عمل ہے- اقبال کے یہاں جو تصور ملتا ہے- اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ زندگی خیر ہے- اور عدم زندگی شر...... برگساں کا فلسفہ قوتیت (Vitalism) کا مطلب بھی یہ ہے کہ زندگی خیر ہے شر نہیں اگر کہیں شر ہے تو وہ زندگی کو آگے بڑھاتا ہے- کیونکہ وہ عمل پر اکساتا ہے- اقبال کے نزدیک ابلیس نمائندہ شر نہیں بلکہ وہ تو اکتاہٹ اور بیزاری کو دور کر کے زندگی کو ترو تازگی عطا کرتا ہے- سلیم احمد کے الفاظ میں "اقبال کا شیطان قوت، حسن اور عمل کا نمائندہ ہے-"(۳)

اقبال ابلیس کو دو تین چیزوں کا نمائندہ سمجھتے ہیں- اور یہی چیزیں خودی کی ترقی کے لئے ضروری ہیں- مثلاً" سب سے پہلے مزاحمت ہے جو ابلیس کا ایک زبردست حربہ ہے- یہ مزاحمت ترقی کے لئے ضروری ہے- پھر ابلیس انکار کا نمائندہ ہے- اس کا عمل رکاوٹ سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے- پھر ابلیس کی فطرت میں خودنگری، خود پرستی اور خود پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے- یہی خوبیاں یا خامیاں خود انسان کی فطرت میں بھی پوشیدہ ہیں

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

(تسخیر فطرت..... پیام مشرق)

دراصل ابلیس کی ماہیت کا مسئلہ خیر و شر کا مسئلہ ہے- حیات و کائنات میں خیر و شر کا جھگڑا ازل سے جاری و ساری ہے- جرمن فلسفی لائی بینز نے شر کی تین

Scanned by CamScanner

...ہیں والی ہیں۔ ایک شر طبعی ہے۔ جیسے طوفان، زلزلے، بیماریاں، سیلاب وغیرہ،
...رساں ہیں۔ یہ انسانی ارادوں کی پیداوار نہیں بلکہ فطرت کی پیدا کردہ ہیں۔
...ری قسم نفسی یا اخلاقی شر کی ہے۔ جو انسان کے اختیار کے غلط استعمال سے پیدا
... اسی طرح شر کی تیسری قسم مابعد الطبیعاتی شر کی ہے۔ یعنی مخلوق میں
...ی ہوتی ہے۔ جس کو شر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خدا ہی خیر مطلق
...ہے۔ خدا کے سوا ہر مخلوق میں کچھ نہ کچھ کمی کا ہونا لازمی ہے۔ اور ہر کمی ایک قسم
...شر ہے۔ حالی کے نزدیک کائنات کی فضیلت شر پر قائم ہے۔ اقبال کے یہاں بھی
...ری توضیحات میں اس قسم کے نظریات شامل ہیں۔

اقبال کے تصور خودی کی نمود خیر و شر کی خصومت (Duelism) سے ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو پیکار تصور کرتے ہیں۔ اور اس پیکار کی بنیاد شر اور خیر کی ثنویت ہے۔ اس پیکار کے بغیر زندگی سکون آشنا ہو کر رہ جائے گی۔ اور سکون آشنا زندگی اقبال کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی جنت کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں۔ جہاں شیطان کا شر نہ ہو۔ آدم کا گناہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے جنت کا سکون نہیں دنیا کا اضطراب چاہئے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں۔

مزی اندر جہان کور ذوقی
کہ یزداں دارد و شیطان ندارد

یا

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے درد مندے، نہ غمے، نہ غم گسارے

شیطان عمل، حرکت، اضطراب اور کوشش کا داعی ہے...... ظاہر ہے خودی کے لئے یہ تمام اعمال باعث برکت ہیں۔ اس لئے خودی اور شیطانی قوتیں لازم و ملزوم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان معنوں میں کہ خودی کی وجہ حیات ابلیس کا شر ہے۔

تاج محمد خیال نے غلط نہیں کہا کہ

"جدید نفسیات کے لئے بھی خیر و شر اور نیک و بد دونوں بحیثیت موضوع مطالعہ یکساں اہمیت رکھتے ہیں...... اقبال کی نگاہ میں بدی یا شر انسانی فطرت کا ایک

Scanned by CamScanner

جزو لاینفک ہے۔ یہ ایک محرک طاقت ہے جو اسے حرکت و عمل پر اکساتی ہے۔"(۴)

خودی حرکت و عمل سے مستحکم ہوتی ہے۔ اور شیطان حرکت کا نمائندہ ہے۔ پیام مشرق کی ایک نظم "تسخیر فطرت" میں ابلیس اپنے آپ کو حرکت کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ وہ ذات باری سے کہتا ہے کہ سب ہنگامہ حیات، زندگی کی تمام گہما گہمی اور رونق اس کی وجہ سے ہے۔ وہ نہ ہوتا تو نہ کائنات میں جنبش نظر آتی اور نہ زندگی میں سوز و ساز پیدا ہوتا۔ میرے ہی سوز سے خون رگ کائنات میں تپش ہے۔ تو نے ستاروں کا وجود قائم کیا تو میں نے انہیں گردش سکھائی۔ تو نے بدن میں روح بھر دی لیکن اس روح میں ہنگامہ آرائی میری بدولت ہے۔ تو سکون کی راہ دکھاتا ہے۔ لیکن میں تپش اور گرمی کا رہبر ہوں۔

می تپد از سوز من خون رگ کائنات
من بہ دو صرصرم، من بہ غو تندرم
رابطہ سالمات، ضابطہ امہات
سوزم و سازے دہم آتش مینا گرم
از زو من موجہ چرخ سکوں ناپذیر
نقش گر روزگار، تاب و تب جوہرم
پیکر انجم زتو، گردش انجم زمن
جاں بجہاں اندرم، زندگی مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی، شور بجاں من دہم
تو بہ سکون رہ زنی، من بہ تپش رہبرم

(تسخیر فطرت... پیام مشرق)

شیطان کے آتش نژاد ہونے کے بھی یہی معنی ہیں کہ موجودات کا وجود حرارت سے ہے۔ اس سلسلے میں ابن العربی نے ایک نہایت معنی خیز بات کہی ہے کہ

Scanned by CamScanner

...کے پھل دوزخ کی آگ سے پکتے ہیں۔"...... گویا خیر کے لئے شر کا وجود ...ا ہے۔ یہاں اقبال ابن العربی سے متفق ہیں۔ کبھی کبھی تو اقبال شیطان کو اتنی ...دیتے ہیں کہ وہ مرد کامل کی دوسری صورت دکھائی دینے لگتا ہے۔ "جبریل و ...یس" (بال جبریل) میں شیطان کی شخصیت بہت زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے۔ ...یل اس سے عالم رنگ و بو کی حالت دریافت کرتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل ابلیس کو وہ گلیاں یاد دلاتے ہیں جن میں دونوں کی جوانی گزری تھی پھر اس کے دل میں خواہش پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ کہہ کر کہ

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

ابلیس کہتا ہے۔

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو

چنانچہ اقبال خاموش عالم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ ہنگامہ و حرکت کو حیات سمجھتے ہیں۔ آدم کا کمال اس کی سعی پیہم سے وابستہ ہے۔ اگر شیطان اس کو بھی سکونی جنت سے نہ نکالتا تو اس کو یہ تگ و دو کہاں سے نصیب ہوتی۔ اب آدم اپنی مساعی سے جو جنت بنائے گا وہ اس کے خون جگر کی پیداوار ہو گی۔ وہ اس کی اپنی کمائی ہو گی۔ جو اس کی کوشش پیہم کی جزا ہو گی۔

جنت تیری پنہاں ہے تیرے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

اس بحث کے لئے عزیز احمد کی کتاب "اقبال .... نئی تشکیل" کا مطالعہ خالی

از دلچسپی نہیں۔ انہوں نے منفرد انداز میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ اور مسئلہ خیر و شر کو سلجھایا ہے۔ شیطان حیلہ گر ہے۔ وہ متضاد صفات کا حامل ہے۔ وہ ہر لباس میں جدوجہد کا مبلغ ہے۔ "جاوید نامہ" میں ابلیس کے متعلق دو نظمیں ہیں۔ ایک کا عنوان ہے۔ "نمودار شدن خواجہ اہل فراق" .... دوسری نظم کا عنوان "نالہ ابلیس" ہے۔

خواجہ اہل فراق میں اقبال نے ابلیس کو کئی متضاد قسم کی صفات کا مجموعہ بتایا ہے۔ وہ حیلہ ساز بھی ہے اور حکیم نکتہ رس بھی۔ وہ صوفی فرقہ پوش بھی ہے۔ اور رند مشرب بھی وہ زاہدوں کی طرح عمل میں سخت کوش ہے۔

رند و ملا و حکیم و خرقہ پوش
در عمل چوں زاہدان سخت کوش

(جاوید نامہ)

اسی سبب سے اقبال کے دل میں اس باعمل کافر اور قتیل سوز و فراق سے بہت ہمدردی ہے۔ کیونکہ اقبال خود بھی سوز و گداز کا دلدادہ ہے۔ اور عمل کا مبلغ ہے۔ "نالہ ابلیس" میں ابلیس آہ وفغاں کرتا نظر آتا ہے اور انسان سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی فطرت خام اور ارادہ کمزور ہے۔ وہ تو اس کی (شیطان کی) ایک ضرب کی تاب بھی نہیں لا سکتا۔ ابلیس کہتا ہے کہ موجودہ انسان تو مٹی کے کھلونے ہیں اور میں مرد پیر' بھلا کسی بڈھے کو زیب دیتا ہے کہ مٹی کے کھلونوں سے کھیلے۔ ابن آدم تو اس کے لئے مٹھی بھر خس کی مانند ہے۔ جس کے لئے اس کا ایک شرار ہی کافی ہے۔ اس کے لئے تو کوئی ایسا پہلوان چاہئے جو اس کی گردن مروڑ سکے۔ اور جس سے مقابلے کا مزہ آئے۔ ظاہر ہے یہ پہلوان مرد مومن ہے۔ جو اقبال کا انسان کامل ہے۔ اور جس کی خودی مستحکم اور استوار ہے۔ اس سے تو شکست کھانے میں بھی مزہ ہے۔

ابن آدم چیست؟ یک مشت خس است
مشت خس رایک شرار از من بس است

Scanned by CamScanner

اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود
آنچناں تنگ از فتوحات آدم
پیش تو بہر مکافات آدم
بندۂ باید کہ پیچد گردنم
لرزہ اندازد نگاہش در تنم
اے خدا یک زندہ مرد حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

دراصل اقبال انسان میں ایک تخلیقی قوت دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کا تصور انسان یہ ہے۔ کہ وہ ایک آزاد عامل کی حیثیت سے خدا کا معاون بنتا ہے۔ تخلیق، ارتقاء اور اقدار کی تکمیل کے لئے عمل پیدا کرنے کے لئے اس کا محرک شیطان ہی ہے۔ کیونکہ ہر ترقی، ہر تبدیلی اور ہر وہ شے جو زندگی کا باعث بنتی ہے عمل سے ظہور میں آتی ہے۔ اور اس عمل کا درس روز ازل شیطان ہی نے اسے دیا تھا۔ ورنہ آدم اپنی سکونی جنت کو خیرباد کیوں کہتا۔ آخر میں بقول تاج محمد خیال

"جب حرکت و عمل کی زندگی اتنی اہمیت رکھتی ہے اور شیطان ہر طرح کی آزادی، سعی و کوشش، آرزو و عمل کا پیکر ہے تو نظام عالم میں اس کا مقام بہت بلند ہونا چاہئے۔ اور در حقیقت ہے بھی بلند۔"(۵)

حوالہ جات

۱۔ "فلسفہ اقبال" مطبوعہ بزم اقبال بار سوم ۱۹۷۰ء ص ۷۲
۲۔ بحوالہ "فکر اقبال" از خلیفہ عبدالحکیم
۳۔ "اقبال ایک شاعر" ------ از سلیم احمد
۴۔ فلسفہ اقبال ص ۷۱
۵۔ ---- ایضاً" ---- ص ۷۳

Scanned by CamScanner

اقبال کا نظریہ تعلیم

پاکستان کی تخلیق کے بعد سے آج تک مختلف اوقات میں ایک موزوں اور مناسب نظام تعلیم کی تلاش کے لئے ہر حکومت نے اپنے دور میں تعلیمی کمیشن بٹھائے اور اصلاحات کی کوششیں کیں لیکن ہمارے قومی کردار کے سبب سے ابھی تک کوئی مثالی نظام ترتیب نہیں دیا جا سکا۔ اور ہمارا تعلیمی نظام ہنوز رو بہ زوال ہے۔ یہ المیہ کچھ ہمارے ساتھ نہیں تمام ترقی پذیر ممالک اس سے دو چار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ امریکہ روس، فرانس اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی تعلیمی مقاصد اور ان کے حصول کے ذریعوں کے بارے میں بحث جاری ہے۔ اور وقت، فضا اور ماحول کے مطابق کوئی مثالی نظام بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان ممالک میں اخبارات، جرائد، ریڈیو، ٹی وی اور تحقیقاتی کمیشنوں کے حوالے سے مباحث جاری ہیں۔ گویا یہ مسئلہ کسی ایک ملک کا نہیں ایک عالمی مسئلے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہر ملک کا تصور تعلیم اس ملک کی سیاسی اقتصادی اور معاشرتی و مذہبی اقدار اور ضروریات کے تابع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی قوم کا ماضی حال اور مستقبل تعلیم اور اس کے حصول مقاصد میں ایک وحدت اور اکائی کا درجہ اختیار کر جاتے ہیں۔ جب تک ہمارا ملک غلام رہا اس کا

Scanned by CamScanner

نظام تعلیم بھی غالب قوم کے مقاصد کے تحت وضع کیا جاتا رہا۔

علامہ اقبال اس دور کے شاعر ہیں۔ جب ہماری قوم غلامی کے ہاتھوں نقطہ نظر کی وسعت، آزادی کے مفہوم، توانائی اور حریت کے جذبے سے بے بہرہ تھی۔ سرکسوں میں پلنے والا فریب خوردہ شاہین رہ ورسم شاہبازی سے ناآشنا ہو چکا تھا۔ اقبال کے لئے مروجہ نظام تعلیم اور اس نظام کے تحت وضع ہونے والا نصاب نہ تو قابل قبول تھا اور نہ مناسب و موزوں۔ اس لئے کہ اقبال نے جو نظام فکر اور فلسفہ حریت پیش کیا اس میں مروجہ نظام تعلیم فٹ نہ آسکتا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اقبال کے تمام افکار کا سرچشمہ ان کا فلسفہ خودی ہے۔ اسی مرکزی نقطہ سے مستنیر سے تمام دیگر افکار اور خیالات روشن ہوئے ہیں۔ اقبال کا یہ فلسفہ زندگی اور سماج میں ایک انقلابی تبدیلی کا داعی تھا۔ اس کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ ہمہ گیر تبدیلیوں کے بغیر اس مثالی سوسائٹی کا قیام ممکن نہ تھا۔ جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اس لئے جہاں اقبال کا فلسفہ زندگی، موت، فنون، سماج، ہیئت اجتماعی اور زندگی سے متعلق دیگر شعبوں اور پہلوؤں کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ وہاں تعلیم کے بارے میں بھی ایک واضح تصور پیش کرتا ہے۔ اس لئے کہ فلسفہ حیات ہو یا فلسفہ تعلیم دونوں انسانی زندگی کے مشترک مسائل اور مشکلات سے بحث کرتے ہیں۔ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد سماج کے ثقافتی ورثے بنیادی نظریہ حیات اور علمی و فنی تصورات کے سرچشموں کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا ہے۔ تاکہ ہیئت اجتماعی اور تہذیبی تشخص و تسلسل کو قائم رکھا جا سکے۔

یہ درست ہے کہ اقبال نے تعلیم کے عملی و علمی پہلوؤں پر مربوط انداز میں روشنی نہیں ڈالی اور نہ ہی نظام تعلیم پر باقاعدہ غور و فکر کر کے کوئی منظم و منضبط فلسفہ ترتیب دیا۔ تاہم ان کے افکار و اشعار سے ایک واضح نقطہ نظر اور تصور تعلیم اخذ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ اس تصور تعلیم کے ذریعے ایک ایسے مکتب فکر کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ جو ہمارے لئے علمی و تہذیبی لائحہ

عمل کی رہنمائی کا باعث بن سکے۔

اقبال نے یورپ کے مختلف ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ قیام یورپ کے دوران انہوں نے مغربی اقوام کے اسلوب حیات کو قریب سے دیکھا تھا۔ بلاشبہ انہوں نے ان کی استحصالی اور طبقاتی تہذیب کو' جو زیادہ تر ظاہرداری پر مبنی تھی۔ ٹھکرا دیا لیکن ان کی علمی اور سائنسی ترقیوں اور کامیابیوں کو سراہا بھی۔ دراصل اقبال کو وہاں کی مادہ پرستی پسند نہ آئی۔ اہل یورپ کے نظام تعلیم اور نظام معاشرت کی بنیاد عقل پرستی اور مادیت پر تھی۔ جس کو اقبال ایسا مذہبی مفکر کبھی بنظر تحسین نہیں دیکھ سکتا تھا۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

اقبال علم و عمل میں عشق اور روحانیت کی آمیزش کو ضروری تصور کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں انسان کامل کی تعمیر عقل و عشق کے امتزاج کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور جب انسان کامل کی تعمیر نہ ہوئی تو کامل اور مثالی سوسائٹی کا وجود کیسے ممکن ہو گا۔ دوسری طرف اقبال قدیم طرز کے ملا و مکتب سے بھی مطمئن نہ تھے۔ جو بے رس عبادت اور بے ذوق روحانیت کا پرچار کرکے کور ذوقی' کم نگاہی اور بے عملی کو پھیلاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کند ذہن ملا اور تنگ نظر پاپائیت کو تنقید کا نشانہ بنایا جو زندگی کے تقاضوں سے قطع نظر کرکے اپنی بے عملیوں' محرومیوں' اور بد اعمالیوں کا مداوا روحانیت میں ڈھونڈتے ہیں۔

پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں
نے جدت گفتار ہے نہ جدت کردار

دین حق از کافری رسوا تر است
زانکہ ملا مومن کافرگر است

انہوں نے بعض مقام پر ملا کو کوراذوق، کم نگاہ اور بردہ کو کہہ کر پکارا ہے
اور گلہ کیا ہے کہ

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

گویا اقبال نے نہ تو محض مادیت پر زور دیا اور نہ محض روحانیت پر بلکہ دونوں کے امتزاج سے اپنے نظریہ تعلیم میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مادی فلسفے کی تحت وضع ہونے والے نظام تعلیم میں علوم تازہ کی سرمستی کا لطف تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن سوز لا الہ کی موت کا خطرہ بھی لاحق ہوتا ہے۔

اقبال کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصد تخلیقی سرگرمی اور ترقی پسندانہ جدوجہد کا تسلسل قائم کرنا ہے۔ اس باشعور لیکن پرعزم جدوجہد کے بل بوتے پر انسان اس کائنات کی تسخیر پر آمادہ ہوتا ہے اور اپنی شخصیت کے ارتقاء سے امکانات کی دنیا روشن کرتا ہے۔ خواہ یہ امکانات اس کے اندر کی صلاحیتوں سے متعلق ہوں یا اردگرد پھیلی ہوئی کائنات سے وابستہ ہوں ۔ اقبال تعلیم کے ذریعے نئی معنویت کو پانے کا گر سکھاتے ہیں۔ وہ فرسودہ رسموں ، ضعیف الاعتقادیوں اور اوہام پرستیوں کے سخت مخالف ہیں۔ اور پیکر فرسودہ کو توڑ دینے کی تلقین کرتے ہیں

پیکر فرسودہ را دیگر تراش
امتحان خویش کن موجود باش

اسی طرح اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

”آئین حیات کیا ہے“ جہد مسلسل ”“ پھر تعلیم کی غرض و غایت کیا ہونی ہے۔ بدا بتہ ” کشمکش حیات کی تیاری۔ جو قوم محض ذہنی تفوق کے لئے کوشاں

ہے۔ اپنے طرز عمل سے اپنی ناتوانی کا اظہار کرتی ہے۔"

اس ناتوانی کو دور کرنے کے لئے اقبال کے پاس کو جو نسخہ کیمیا ہے وہ خودی کا درس ہے۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد بھی تکمیل خودی ہونا چاہئے کیونکہ خودی ہی سے ساری شخصیت کی تکمیل اور تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ہمارے خیالات منتشر اور افکار بے ربط ہو جاتے ہیں۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط نظام

علامہ اقبال یہ جانتے تھے کہ مروجہ نظام تعلیم غیر ملکیوں کا وضع کردہ ہے۔ جس میں سے خودی کا جوہر نکال لیا گیا ہے۔ تاکہ نئی نسل سے اس جوہر کامل کو پوشیدہ رکھ کر انہیں عرفان و بصیرت سے بے نصیب کر دیا جائے۔ چنانچہ طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

بے مقصد نظام تعلیم یا علم برائے علم کے نظریے پر یوں تنقید کرتے ہیں

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی نور جگر ہے علم ہے نور دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

اقبال کے نزدیک استاد اپنے شاگرد کو جو پہلا سبق دے وہ احساس ذات خود شناسی اور خودی کا ہو۔ کیونکہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ چنانچہ اقبال کے تصور تعلیم میں ایک مثالی استاد کا تصور بھی شامل ہے۔ استاد کے

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

نصاب ناقص اور ناموزوں ہیں۔ ہم دوسری اقوام کے مقلد ہیں۔ اپنے ماحول اور اپنے یہاں کے نظام کو سامنے رکھے بغیر نصاب مرتب کراتے ہیں۔ اور اپنے مفاد کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ کتابیں جو حریت فکر کا درس دیتی ہوں۔ نصاب سے خارج کر دی جاتی ہیں۔ نصاب بنانے والے مخصوص لوگ ہوتے ہیں۔ ایک مخصوص نقطہ نظر کے نمائندے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد اور تنگ نظریات کے مطابق کتاب تیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب تک پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک نصاب ایک لبرل نقطہ نظر اور زمانے کے اقتضاء کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب نہیں کئے جائیں گے۔ اس وقت تک تعلیم کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آ سکتے۔

غرض تعلیم کی غایت وہی ہے جو کلی تصور حیات کی غایت ہے۔ اقبال جس طرح حیات کے دیگر شعبوں میں ان عوامل کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو انسان میں تخلیقی قوتوں کو خشک کریں۔ قوت عمل کو مفقود کریں۔ اسلامی کردار کی تشکیل میں رکاوٹ بنیں اور خودی کو کمزور کریں اسی طرح اقبال تعلیم کے اس تصور کے بھی سخت مخالف ہیں۔ جس سے انسان کے اندر تھوڑی بہت دانش برہانی تو پیدا ہو لیکن دانش نورانی کا چراغ گل ہو جائے۔ اس لئے وہ طلباء کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں، فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

Scanned by CamScanner

تنقید اقبال کی ایک نئی جھلک

اقبال کی شخصیت اور فکر کی تشریح و توضیح عموماً" اس فرسودہ اور گھسے پٹے انداز میں کی گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ اقبال کا اصل چہرہ گم ہو کر رہ گیا بلکہ اقبال کے خواب کی تعبیر بھی پریشان ہو کر رہ گئی۔ اقبال کے نکھرے ہوئے سچے اور کھرے چہرے پر تقدس اور نور کا وہ نقاب ڈال دیا گیا کہ آنکھیں اقبال کی اصل صورت دیکھنے کو ترس گئیں۔ کچھ لوگ تو روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے اعمال کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر کلام اقبال کے پل صراط سے گزرے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے ہاتھ تو قلم نہ ہوئے پاؤں ضرور کٹ گئے۔ البتہ اقبال کی وراثت کا دعوی انہوں نے کبھی نہ چھوڑا اور یوں انہوں نے بزعم خویش اپنی جنت پکی کر لی۔

ہر بو لہوس نے عشق پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

فکر اقبال کے آئینے میں ان لوگوں نے صرف ایک ماورائی اور مابعد الطبیعاتی فلم کی جھلک دیکھی۔ انہوں نے اپنے عقائد کی تعمیر کردہ مثالی دنیا کی تلاش کلام اقبال کے حوالے سے کی اور یوں سامنے کی زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ اقبال کو سب سے زیادہ نقصان ان نام نہاد اقبال شناسوں نے پہنچایا ہے

Scanned by CamScanner

جو اقبال کے سرٹیفکیٹ سے تھرڈ کلاس کے الفاظ کھرچ کر اور ان کے والد محترم کے پیشہ درزی کو یا تو بالکل محو کر کے اور یا پھر زیادہ سے زیادہ خیاطی کا پیشہ کہہ کر اپنے کمپلکس پر پردہ ڈالنے کی انفیکچول کوشش میں مصروف رہے۔ اقبال سے ان نام نہاد شناساؤں کی دوستی کسی دشمنی سے کم نہیں۔

سلیم اختر کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ۔

"مشرق کے آداب شرافت میں شخصیت پرستی کو بلاوجہ جو اساسی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کے مضر اثرات نے شخصیت نگاری کو بالخصوص اور تنقید کو بالعموم متاثر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے تحریر میں سیرت بھاری سنہری ملبوسات میں لپٹی خوش رنگ اور خوش نظر تو معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت کے رنگ و بو سے عاری ہوتی ہے۔"(۱)

علامہ اقبال کے پرستار بھی اس شخصیت پرستی کا شکار ہوئے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نسل کے سامنے نہ تو اقبال کی کمزوریوں سے پر شخصیت آئی اور نہ ان کی ذات کی وہ خامیاں بے نقاب ہو سکیں جو ایک ڈینامک (Dynamic) شخصیت کی آئندہ کامیابیوں کی محرک بنتی ہیں۔ اقبال نے جن انسانی کمزوریوں کو اپنی پر عظمت شخصیت کا کمپلکس نہ بننے دیا۔ اقبال کے نام نہاد ہوا خواہوں نے ان کمزوریوں کی پردہ پوشی کر کے نفلوں کا ثواب کمایا۔ ایک طرف تو یہ مجاہد تھے۔ جنہوں نے کلام اقبال کے ہفت خواں طے کرنے کے کھوکھلے دعوے کئے۔ لیکن پہلی ہی منزل پر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ دوسری طرف وہ سنجیدہ اور باشعور بادہ خوار اور ندمشرب لوگ بھی تھے۔ جنہوں نے فکر اقبال کی تشریح و تعبیر معروضی رویوں کی روشنی میں کی۔ سچے اور کھرے چہرے والے اقبال کو تلاش کیا۔ مزدوروں کے دوست، قوت سے پر انقلاب کے داعی، خانقاہی زندگی کے نقاد، سرمایہ داری، اور استحصالی نظام کے نکتہ چین اس رند بادہ خوار کی تلاش کی جو مستی میں سچی بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ ان چند لوگوں میں عزیز احمد "اقبال نئی تشکیل" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، (فکر

اقبال) ڈاکٹر یوسف حسین خان (روح اقبال) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (اقبال سب کے لئے) خواجہ محمد زکریا (اقبال کا ادبی مقام) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (اقبال کا ذہنی ارتقاء) پروفیسر محمد عثمان (حیات اقبال کا ایک جذباتی دور) نمایاں ہیں۔

آج میں اس فہرست میں ڈاکٹر سلیم اختر کے نام کا اضافہ کرتا ہوں جنہوں نے اقبالیات کے سلسلے میں خاصا وسیع کام کیا ہے۔ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" فکر اقبال کے منور گوشے' شعاع صد رنگ' اقبال کا ادبی نصب العین' اقبالیات کے نقوش ان کی تصنیف و تالیف کی ہوئی کتب ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر ان کی اہم تصنیف "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ہے جو اقبالیات کے سلسلے میں ایک فکر انگیز کتاب ہے۔

اس کتاب کے دو عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ ایک شخصیت جس کے تحت اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان کی پہلی شادی اور خانگی زندگی کے واقعات کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اور ایک مضمون میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کے اس موقف پر بحث کی گئی ہے کہ "اقبال نرگسی ہے۔" پہلا مضمون اقبال کا نفسیاتی مطالعہ حاصل کتاب ہے۔ اور غالباً" اس لئے کتاب کا عنوان بھی اس مضمون کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی شخصیت پر لکھی گئی کتابوں' مکتوبات' نوٹ بک اور ڈائری وغیرہ کے حوالوں سے اس اقبال کو دریافت کرنے کی سعی کی گئی ہے جو کبھی "جوان ہو گا اور جس کے قلب و نظر اور ذہن متنوع اثرات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہوں گے۔"

اگر حالی سرسید ایسے ثقہ بزرگ کے کنکوے اڑانے' کبوتر پالنے اور مجرے دیکھنے کا ذکر کر سکتا ہے اگر ڈاکٹر وحید قریشی' مولوی شبلی کی حیات معاشقہ لکھ سکتے ہیں تو سلیم اختر نے اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کر کے کون سا گناہ کیا ہے۔ کہ جس پر بری طرح برسا جائے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس مضمون میں جو استدلال اختیار کیا ہے اسے آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مضمون سلیم اختر کے چند نہایت اہم مضامین میں

Scanned by CamScanner

شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ "کیا اقبال نرگسی تھے؟" اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا منفرد مضمون ہے۔ اس میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کے اقبال پر ایک مضمون کو بنیاد بنا کر خودداری، خود پسندی، خود شناسی، تعلی، تصوریت انا اور نرگسیت کی اصطلاحات کے فرق کو ڈاکٹر سلیم اختر نے بڑے منطقی انداز میں واضح کیا ہے یہ دلائل اس نتیجے پر پہنچے کہ

"اقبال جو حرکت و جدوجہد کا شاعر ہے۔ جو وصل پر فراق کو اس لئے ترجیح دیتا ہے کہ یوں آرزو کا شعلہ فروزاں رہے گا۔ اور جو سعی مسلسل کی بناء پر جبرائیل پر ابلیس کو برتری دیتا ہو۔ اس اقبال کے اساسی تصور کو محض نرگسیت زدہ قرار دے کر اسے جنینی دور کی طرف مراجعت کیسے کہا جا سکتا ہے۔" (۲)

اقبال کی پہلی شادی اور خانگی زندگی کی تحت ڈاکٹر سلیم اختر نے مولانا سید حامد جلالی کی تالیف علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی یعنی والدہ آفتاب کے مندرجات کو بنیاد بنا کر اس پر استدلال کیا ہے۔ اور استدلال کے لئے خالد نظیر صوفی کی تصنیف "اقبال درون خانہ" کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

دوسرے حصے "فکر و فن" میں کئی مضمون شامل ہیں جن میں پہلا مضمون "اقبال کا تنقیدی شعور" ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی تنقیدی بصیرت کا جائزہ بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے۔ اقبال علم عروض کے علاوہ علم بیان اور اس کے دقیق مسائل سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کے نزدیک شاعری مقصود بالذات نہ تھی حصول مقصد کا ذریعہ تھی وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے۔ بلکہ ادب کی معاشرتی اور انقلابی حیثیت کے قائل تھے۔ ادب کو ایک حرکی عمل اور قوت حیات میں اضافے کا باعث سمجھتے ہیں۔ چند اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ اقبال بھی "تلمیذ الرحمان" والے نظریہ کے قائل تھے۔ وہ شعر کو آمد کی پیداوار اور قلب کو شاعری کا مرکز سمجھتے تھے۔

۲۔ اقبال اصناف سخن کی قدیم تقسیم اور کلاسیکی معائیر کو نہ صرف پسند کرتے

Scanned by CamScanner

تھے بلکہ اس کو برقرار رکھنے پر اصرار بھی کرتے تھے۔
۳۔ اقبال زبان کو حرکی تصور کرتے ہوئے اس کی تغیر پذیری کو تسلیم کرتے ہیں۔
۴۔ مختلف قلوب اور طبائع پر شعر کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔

" تو شب آفریدی چراغ آفریدم " میں اقبال کے تصورِ فن کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ "حالی اور اقبال کے مقامات آہ وفغاں" غزل میں نئی جہت " اقبال کی نثر کا مزاج " "کیا آج اقبال کی ضرورت ہے .... یہ سب مضامین اقبالیات کے مطالعہ میں ایک نئی جہت کا اضافہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نفسیاتی نقاد ہیں۔ اور نفسیاتی نقادوں کے یہاں کبھی کبھی الجھاوا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر تجزیہ صحیح نتائج پر منتج ہو۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے ان مضامین کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا ذہن اپنے موقف کے سلسلے میں بالکل واضح اور صاف ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں بڑی صفائی سے کہہ جاتے ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ نہ اسے نفسیات کی گراں بار اصطلاحات سے بوجھل بناتے ہیں۔ انہوں نے اقبال سے محض اپنی عقیدت کا اظہار نہیں کیا بلکہ ایک متوازن اور دیانت دار ناقد کی طرح اپنی مثبت اور منفی رائے بڑی بے باکی سے دے دی ہے۔ لیکن کہیں ایک جگہ بھی احترام میں فرق نہیں آیا۔ "اقبال کی نثر کا مزاج " میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کی نثری کاوشوں کے تجزیاتی مطالعے سے پیشتر اس حقیقت کا ذہن نشین رکھنا لازم ہے کہ موضوعات اور مسائل کے اعتبار سے ان میں سے بیشتر ایسے مقالات ہیں جن کی آج چنداں اہمیت نہیں۔ میرا مطلب ہے اقبال کے نام سے الگ کرکے بطور ایک واحد مضمون کے " (۳)

اسی طرح اقبال کی ناقدانہ صلاحیتوں کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

" نہ اقبال نے ادبی تنقید کو کوئی نیا نظریہ دیا نہ ہی اپنے تنقیدی مباحث کی

روشنی میں ہم عصر ادب کی تشریح و تحلیل کی۔ اسی طرح خطوط یا متفرق مضامین سے اقتباس جمع کرنے کے باوجود بھی ان میں وہ شرح و بسط نہ ملے گی جو کسی باضابطہ تنقیدی مضمون کی خصوصیت ہوتی ہے۔ لیکن بکھرے بکھرے خطوط میں یہ بکھرے بکھرے خیالات ایسے اشارات کی صورت یقیناً" اختیار کر جاتے ہیں جنہیں بلا جھجک اقبال کے تنقیدی شعور کی تفہیم کے لئے اشارے قرار دیا جا سکتا ہے۔" (۴)

سلیم اختر کا اسلوب بڑا واضح سادہ اور سائنٹفک ہے۔ اس میں نہ تو الجھاؤ ہے نہ خشکی نہ بے جا آرائش ' اس میں اظہار و ابلاغ کی خوبی ہے۔ وضاحت ہے حسن ہے اور بات کہنے کا سیدھا انداز ہے۔ مثلاً"

"بحیثیت مجموعی اقبال کے نظریہ ادب کا جائزہ لیں تو واضح ہو گا کہ اس کے خمیر میں مشرقی شعری روایات کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ لیکن وہ ان روایات و مسلمات کے اندھے پجاری نہیں بنے۔ بلکہ یہ روایات ' یہ کلاسیکی معائیر' یہ شعری سانچے اور یہ قدیم اسالیب سب ان کے ماہر ہاتھوں میں گویا گیلی مٹی بن جاتے ہیں۔ اور اقبال ایک ماہر فن کوزہ گر کی مانند ان سے دلکش جام و مینا بناتے ہیں۔ اور اسی میں اقبال کی عظمت کے راز ہے۔" (۵)

یا

"فن کار کی منزل محض فطرت کو شرمندہ کرنا نہیں اور نہ فطرت کی غلامی سے ہنر کو آزاد کرانا اس کا منصب ہے۔ کیونکہ اقبال اس کے لئے زیادہ بلند مقام بھی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی تخلیق سے فطرت کا صیاد بننے کے بجائے فطرت کو زیر کرتا اور اس کی کجی کا توڑ دریافت کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی تخلیقی صلاحیت اعجاز ہنر کی صورت میں اسے خدا کی سطح تک لے آتی ہے۔" (اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ص ۱۶۲)

یا

"اقبال نے قوم کے لئے جو لائحہ عمل تجویز کیا ہے اس کی ترسیل کے لئے

لئے غزل موزوں نہ تھی۔ غزل میں جو انتشار فکر ہے وہ زندگی کو جرعہ جرعہ پینے کے مترادف ہے۔ جبکہ زندگی کے سمندر میں ڈوبنے والے کے لئے تو غزل سمندر سے پیاسے کو شبنم ملنے والی بات بن جاتی ہے۔ اس لئے وہ نظم نگاری کی طرف مائل ہوا۔ بلکہ نظم یوں مزاج میں رچ گئی کہ بیشتر غزلیں بھی مسلسل ہو کر نظم ایسی صورت اختیار کر گئیں۔ ہمارے قدیم شعراء نے بھی بعض اوقات مسلسل غزلیں کہیں ہیں۔ لیکن ان کے نفسی محرکات جداگانہ تھے۔ وہاں جذبے کا دریا جب دو مصرعوں کے کوزے میں بند نہ ہو سکا تو سیلاب میں کناروں سے چھلکتے دریا کی مانند پھیل کر مسلسل غزل کا روپ اختیار کر گیا۔" (۶)

آخر میں اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی قیمتی رائے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ

"شخصیت اقبال کا نفسیاتی تجزیہ سلیم اختر کی انسان دوستی کا زندہ ثبوت ہے۔ علامہ اقبال کی مرتبہ شناسی اور اعتراف کے ساتھ ساتھ بہ حیثیت انسان ان کے خصائص و ذوق کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اور جلوت کے ساتھ خلوت کے احوال سے بھی روشناس کرایا ہے۔ .... اقبال کے متعلق لکھی جانے والی نئی کتابوں میں سلیم اختر کی یہ کتاب ارمغان فکر سے کم نہیں۔" (بحوالہ فلیپ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ)

حوالہ جات

۱۔ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ص ۲۰ مکتبہ عالیہ لاہور
۲۔ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ص ۸۸
۳۔ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ص ۲۲۷
۴۔ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" ص ۲۰۷
۵۔ ---ایضا" --- ص ۱۸۳
۶۔ "اقبال نفسیاتی مطالعہ" ص' ۱۲۶

اقبال اور ترکمان سخت کوش

کلام اقبال کا ایک خاصا حصہ ترکوں اور ترکوں کے نجات دہندہ عظیم رہنما مصطفیٰ کمال پاشا کی بے مثل بہادری، جرات، استقامت، استقلال اور حریت پسندی کی تعریف پر مشتمل ہے۔ یہ تعریف یقیناً" استحقاق کی بنیاد پر ہے۔ اگر اقبال نے اندلس کی طرح سرزمین ترکی کی سیاحت بھی کی ہوتی تو ان کے کلام کا ایک اس سے بھی بڑا حصہ ترکوں کے حسن و جمال، حسن اخلاق، خوش خوئی اور خوش خصالی کی تعریف میں ہوتا اور یہاں کی نگاہوں کے تیر بھی اہل اندلس کی نگاہوں کے تیروں کی طرح ان کے دلنشین ہوتے۔

جس زمانے میں اقبال نے ترکوں کی مدح میں نظمیں اور غزلیں کہیں اس دور میں کم و بیش تمام عالم اسلام زوال اور شکست و ریخت کی زد میں تھا۔ ساری دنیا کے مسلمان ممالک بحران کی صورت میں تھے۔ مایوسی اور ناامیدی ان پر اس قدر غالب آچکی تھی کہ مقاومت کا حوصلہ ان میں باقی نہ رہا تھا۔ اول تھا یا آخر، ظاہر تھا یا باطن، نقش کہن تھا یا نو............ سب کی منزل فنا دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن علامہ اقبال نے مایوسیوں اور ناامیدیوں کے اس دور میں بھی ترکوں کی بہادری اور آزادی کی تڑپ میں امید کی کرن پھوٹتی ہوئی دیکھی کیونکہ تمام عالم

Scanned by CamScanner

اسلام میں یہی وہ واحد مسلمان قوم تھی جو نہ تو کبھی غلام بنی اور نہ غلامی کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کیا بلکہ مسلسل جدو جہد اور مقاومت کی بدولت استعماری قوتوں کو شکست دے کر اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔

اس دور میں جب ترکی نے بہادری کی ایک نئی تاریخ لکھی، تمام دنیا کے مسلمانوں کی حالت مایوس کن تھی بلکہ اسے مسلمانوں کا تاریک دور کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ایک ایسا دور مغربی اقوام پر بھی آیا تھا۔ جسے انہوں نے تاریک دور (Dark Ages) کا نام دیا تھا۔ حالانکہ اس دور میں عموماً" عالم اسلام اور خصوصاً" اسپین میں فکر و فلسفہ، علم و فن اور تہذیب و معاشرت اپنے عروج پر تھی۔ ابن ماجہ، ابن طفیل، ابن باجہ اور ابن رشد جیسے عقلی فلسفی دنیا بھر کی فکری اساس کو متاثر کر رہے تھے۔ یہ فلسفی صدیوں تک یورپ کے حواس پر چھائے رہے۔ لیکن یورپی مورخین نے اس دور کے ان فکری کارناموں کو جو مسلمان فلسفیوں اور حکیموں نے انجام دیئے۔ نظر انداز کر کے اسے "دور ظلمات" کا نام دیا۔ اگر انیسویں صدی کو ہم بھی "مسلمانوں کا دور ظلمت" کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ اس لئے کہ اس دور میں کم و بیش تمام عالم اسلام فکری، سیاسی، معاشرتی، اور اقتصادی طور پر پسماندہ اور فرسودہ ہو چکا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں پر زوال اور انحطاط کی کیفیت پوری طرح غالب آگئی۔ یوں تو پچھلی کئی صدیوں سے ان پر زوال اور فرسودگی کے آثار غالب تھے۔ لیکن اہل فرنگ کی ہوس ملک گیری اور توسیع پسندی نے اس زوال کو تیز تر بھی کیا۔ اور اقوام مسلم کو اپنے استعمار و استحصال کا نشانہ بھی بنایا۔ ۱۸۸۱ء میں تیونس پر فرانس نے قبضہ جمایا۔ اس سے دوسرے سال مصر برطانیہ کی زد میں آگیا۔ ۱۸۹۹ء میں سوڈان پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی والے لیبیا پر مسلط ہوئے۔ ادھر ایران پر روس اور برطانیہ کا اثر و نفوذ بڑھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں دونوں ملکوں کی فوجیں ایران میں قیام پذیر رہیں۔ یہ صورتحال ۱۹۲۱ء

Scanned by CamScanner

تک قائم رہی۔ برصغیر پاک و ہند میں برطانوی سامراج کا تسلط اور غلبہ ۱۸۵۷ء سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔

ترکی کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی ترکی بھی ہتھیار ڈال چکا تھا اور اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہو کر ترکی کے حصے بخرے کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ترکی کی طاقت منتشر ہو چکی تھی۔ کبھی مغلوب نہ ہونے والی قوم اب اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں دوسرے اسلامی ممالک کی طرح غلامی کا جوا اس کی گردن پر بھی رکھا جانے والا تھا۔ ترکی کا سلطان سیورے کے معاہدے Treaty of sevre کے بعد محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ ترک فوج کو منتشر بھی کیا جا رہا تھا اور غیر مسلح بھی، اقبال نے عالم اسلام کی اسی صورت حالات کو "پیام مشرق" کے ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

مصریان افتادہ در گرداب نیل
ست رگ تورانیان ژندہ پیل
آل عثمان در شکنج روزگار
مشرق و مغرب زخونش لالہ زار
عشق را آئین مسلمانی نماند
خاک ایراں ماندو ایرانی نماند
سوز و ساز زندگی رفت از گلش
آں کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلم ہندی شکم را بندۂ
خود فروش دل زدیں برکندۂ
در مسلمان شان محبوبی نماند
خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ و ایوبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماند

(پیام مشرق.......... پیشکش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ)

Scanned by CamScanner

ترکوں کی حالت زار کو "خضر راہ" کے ان شعروں میں بھی پیش کیا ہے۔

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

لیکن اسی دور میں ایک مجاہد جس نے گیلی پولی (۱۹۱۵ء) اور درہ دانیال کے مقامات پر اپنی بے مثال بہادری اور ناقابل شکست عزم کی بدولت ہیرو کا درجہ پایا.............. سب کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔ یہ تھا جنرل مصطفیٰ کمال پاشا جس کو مشرقی صوبوں کے انتظام و انصرام کے لئے وہاں کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں یونانی فوجوں نے ازمیر پر قبضہ کر لیا۔ مصطفےٰ کمال اس وقت سمسون میں تھے۔ انہوں نے فوری طور پر مجلس ملی قائم کی اور منتشر فوج کو تنظیم نو کے تحت ترتیب دینا شروع کیا۔ اور بہت جلد اپنی عسکری صلاحیتوں کا ثبوت دیتے ہوئے سب سے پہلے توانونو کی لڑائی میں یونانی افواج کی پیش قدمی کو روکا۔ پھر سقاریہ کے معرکے (۱۹۱۹ء) میں یونانی افواج کو شکست فاش دی۔ اور ۱۹۲۲ء میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا ترک فوجوں کے ساتھ ازمیر میں داخل ہوئے۔ یونانی فوج یہاں سے مایوس ہوئی تو استنبول کی طرف بڑھی لیکن ترک افواج نے اپنے عظیم ہیرو کمال اتا ترک کی سرگردگی میں نہ صرف یونانی فوج کو بلکہ اتحادی فوجوں کو بھی استنبول سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح سیورے کا جانبدارانہ اور ذلت آمیز معاہدہ منسوخ ہوا اور لوزان کانفرنس میں مساویانہ شرائط کا صلح نامہ ۱۹۲۳ء مکمل ہوا۔ اس کے بعد جدید ترکی کی بنیاد رکھی گئی۔ اور ترکوں نے اپنی آزادی برقرار رکھ کر عالم [illegible] کے لئے ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقوام مغرب کی مسلسل شورشوں اور یورشوں نے ترکوں کے عزائم کو مایوسی میں [illegible]

اور بلند کیا۔ اور انہوں نے عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دے کر بہادری اور الوالعزمی کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔ گویا بقول اقبال

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے

اقبال عالم اسلام کے زوال کے شکوہ کناں ہوتے ہوئے بھی ترکوں سے اپنی امیدیں وابستہ کر رہے تھے۔ اس لئے کہ اس وقت تمام دنیا کی ملت اسلامیہ میں محض یہی ایک بہادر قوم تھی جس نے حریت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جدو جہد آزادی کو جاری رکھا۔ "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" .... وہ پہلی طویل اور عظیم نظمیں ہیں جو اقبال نے واضح طور پر ترکوں کی فتوحات سے متاثر ہو کر لکھیں۔ لیکن ان سے پہلے بھی ان کے کلام میں ترکوں کی بہادری کا اعتراف ملتا ہے۔ "حضور رسالت میں" اقبال نے جو نذرانہ پیش کیا ہے وہ طرابلس کے شہیدوں کا لہو ہے۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(بانگ درا)

اسی طرح فاطمہ بنت عبداللہ اور "محاصرہ ادرنہ" وغیرہ بھی اس کی مثالیں ہیں۔ فاطمہ بنت عبداللہ کے ان اشعار میں اقبال نے جس جدید مسلمان نسل کا تصور پیش کیا ہے وہ ترک قوم کے آئینے میں منعکس دکھائی دیتا ہے۔

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں

Scanned by CamScanner

آفرینش دیکھتا ہوں ، ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدہ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانہ ایام سے
جن کی ضونا آشنا ہے قید صبح و شام سے
جن کی تابانی میں انداز کہن بھی نو بھی ہے
اور تیرے کوکب تقدیر کا پر تو بھی ہے

لیکن "خضر راہ" وہ پہلی نظم ہے جس میں اقبال نے واضح طور پر شریف مکہ کے خلاف اور ترکوں کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔ اسی نظم کے ابتدائی حصے میں "ترکمان سخت کوش" کی عارضی ہزیمت پر اقبال کی افسردگی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر جس طرح اس قوم نے اپنی خاکستر سے اپنے وجود کا سامان پیدا کیا۔ اس سے اقبال کو تمام عالم اسلام کے لئے ایک امید افزا پیغام دینے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اپنی بصیرت کلی Total vision کے ذریعے پیشین گوئی کی۔

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلمان آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے زندہ یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

(خضر راہ........ بانگ درا)

اس پیشین گوئی کی تعبیر بہت جلد سامنے آئی اور ترک جدوجہد آزادی میں رخرو ہوئے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے الفاظ میں "اس فکر انگیز نظم اور اس

کے ایمان افروز پیغام کی گونج ابھی فضائے بسیط میں سنائی دے رہی ہو گی کہ ترکان احرار کی شاندار فتح نے " طلوع اسلام " کا ایک نیا دلکش منظر شاعر کی نگاہ کے سامنے کر دیا۔"

" طلوع اسلام " تمام و کمال ترکوں اور ان کے عظیم باپ مصطفےٰ کمال پاشا کی تاریخی جدو جہد سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ عام طور پر اقبال کی نظموں میں تین حصے، تین زمانے اور تین تاثر ہوتے ہیں۔ یعنی ماضی کی عظمت، حال کا زوال اور مستقبل کی امید .... لیکن " طلوع اسلام " سرشاری میں لکھی گئی وہ پہلی نظم ہے جس کا پہلا تاثر بھی پر امید اور والہانہ ہے۔ اور آخری بھی، اس میں افسردگی یا زوال کا نوحہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک نئے دور کے آغاز کی نوید ہے۔ اور اس نئے دور کا آغاز ترکوں کی عظیم فتح سے ہوا تھا۔ اس نئے دور کا آغاز جدید ترکی کے قیام و دوام سے ہوا تھا۔ اور اس کے بعد یورپ کے "مرد بیمار" کا دور گراں خوابی قصہ پارینہ بن گیا تھا۔ ستاروں کی تنک تابی صبح روشن کی دلیل بن گئی تھی۔ مشرق کی مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑ گیا تھا۔ اور اس راز کو سمجھنے کے لئے اس جذبہ و جنون کی ضرورت تھی جو ترکوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ اقبال کی چشم پاک میں اتحادیوں اور یونانیوں کی لاتعداد فوجوں، جدید آلات اور ہتھیاروں سے خیرہ نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس نے مرد غازی مصطفےٰ کمال کی جگر تابی کو دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے تو اقبال نے کہا تھا۔

ربود آں ترک شیرازی دل تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا

(طلوع اسلام .... بانگ درا)

اور اسی نظم میں اقبال نے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی تعریف میں یہ مشہور شعر کہا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور پھر اسی شخصیت کو مرکز نگاہ بنا کر اقبال نے مسلمانوں کی فطرت کو " امین محکمات زندگی " قرار دیا تھا۔ واقعی کمال اتا ترک نے زندگی کے امکانات کو اس وقت منکشف کیا جب بظاہر ترک قوم کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس عظیم قوم نے وہ محیر العقول کارنامہ انجام دیا کہ تمام عالم اسلام جو صدیوں سے کم و بیش سب کا سب اغیار کے زیر نگین آ چکا تھا۔ ان احرار ملت کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی

(طلوع اسلام............ بانگ درا)

تو گویا انہوں نے ترک قوم کی بہادری اور شاندار فتوحات کی ساری تاریخ رقم کر دی۔ جرمن قوم شکست سے دو چار ہوئی تو طویل عرصے کے لئے ہمت ہار بیٹھی۔ لیکن ترکوں نے نامساعد حالات اور بے یار و مددگار ہونے کے باوجود درہ دانیال ' گیلی پولی اور قدہ کے معرکوں میں فتح حاصل کی۔ جنگ عظیم اول میں شکست کے بعد بھی انہوں نے حوصلہ نہ ہارا۔ کمال اتا ترک کی قیادت میں نہ صرف یونانی اور اتحادی فوجوں کو شکست دی بلکہ جدید ترکی کی بنیاد بھی رکھی۔ اور ترقی کی راہوں پر گامزن بھی ہوئے۔ یونانی بڑے کروفر اور سازو سامان کے ساتھ ترکی میں داخل ہوئے تھے۔ اتحادی فوجوں نے استنبول پر قبضہ جما کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ انہیں اپنی عسکری قوت اور جدید آلات حرب پر بھی ناز تھا۔ ادھر شریف مکہ نے بھی انہیں کا ساتھ دیا لیکن بے سروسامان' بے دست و پا ترکوں نے نہ صرف ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا بلکہ انہیں اپنی سرزمین سے بھی نکال باہر کیا۔ اقبال نے " طلوع اسلام " کے اس بند میں ان واقعات کی تاریخ لکھ دی ہے۔

Scanned by CamScanner

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خون شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفون دریا' زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے
غبار رہگذر ہیں' کیمیا پہ ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا
خبر دیتی تھی جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانان تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریان آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر' پائندہ تر' تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے' ادھر نکلے' ادھر ڈوبے ادھر نکلے
یقین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

اسی نظم کے ساتھ ساتھ اگر "پیام مشرق" کی نظم "خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا"......... کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ حقیقت باآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اقبال ترکوں کے جہاد بے تیغ و سپر اور شوق شہادت سے کس قدر متاثر ہوئے تھے۔ ایکطرف تو وہ ترک قوم کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں

نہال ترک زبرق فرنگ بار آورد
ظہور مصطفوی را بہانہ بو الہبی است

(پیام مشرق......... غزل)

اور دوسری طرف کمال اتاترک کے نام اس پیغام سے ترکوں کا دل بھی بڑھاتے ہیں

اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم
دربغل تیر و کماں، کشتۂ نخچیر شدیم
"ہرکجا راہ دہد اسپ براں" ماز کہ
بارہا مات دریں عرصہ بتدبیر شدیم

(پیام مشرق........ خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا)

اس نظم پر جولائی ۱۹۲۲ء کی تاریخ درج ہے۔ اور ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترکوں کی فتح مند فوج ازمیر میں داخل ہوئی اور اس طرح "دربغل تیرو کمان" "یونانی فوج" کشتہ نخچیر ہوئی اور بے دام ترکوں نے یہ صید اپنے فتراک میں ڈال لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکی کی نشاۃ الثانیہ کمال اتاترک جیسے عظیم لیڈر کی قائدانہ صلاحیتوں، غیر متزلزل عزائم اور قومیت کے پرخلوص جذبے کی مرہون منت ہے۔ جدید ترکی کے قیام کے بعد ترک قوم جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی راہوں پر گامزن ہوئی اور اقوام عالم میں معزز مقام کی حامل بنی، قوموں کی تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ آج کا ترکی اپنے مستحکم سیاسی نظام، عسکری قوت، ترقی یافتہ معاشرتی و سماجی نظام، ٹیلی فون، ٹرانسپورٹ، بجلی، پانی، تعلیم، صحت اور دیگر بنیادی سہولتوں کے اعلیٰ سسٹم کی بدولت تمام دیگر مسلمان ممالک سے آگے ہے۔ اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو ترکی کی یہ ترقی دیکھ کر یقیناً" انہیں اس اعتماد اور تیقن پر فخر محسوس ہوتا جو انہیں ترکمان سخت کوش کی بہادری اور الوالعزمی پر تھا۔

Scanned by CamScanner

مسجد قرطبہ ---- اقبال کی ایک شاہکار نظم

۱۹۳۳ء کی ایک شام جب آفتاب کائنات پر لعل بدخشاں کے ڈھیر نچھاور کرتا ہوا پہاڑ کے دامن میں ڈوبتا چلاجا رہا تھا' کرہ آسمانی پر شفق کی سرخیاں پھیل رہی تھیں اور کہیں دور سے کوئی مدھر گیت دریائے کبیر کی لہروں کے دوش پر بہتا ہوا فضامیں ارتعاش پیدا کر رہا تھا' شاعر مشرق "آب رواں کبیر کے کنارے" "مسجد قرطبہ" کے سائے کے نیچے بیٹھا ایک ایسی نظم تخلیق کررہا تھا جسکی بنیادوں میں اس کی فکرو نظر کے تمام عناصر سماگئے۔ جس کی آبیاری اس کے "خون جگر" سے ہوئی اورجسکی رگ وپے میں اس کا وہ فنی خلوص سمٹ آیا جس کو غالب اور اسکن نے "دل گداختہ" کی پیداور بتایا ہے یہی وجہ ہے کہ حرف وصورت کا روپ دھارنے والی مسجد قرطبہ بھی سنگ وخشت میں ملبوس مسجد قرطبہ کی طرح "رنگ ثبات دوام" اختیار کر گئی۔

اس نظم کو اقبال کی شاعر کا تکملہ کہا جاسکتا ہے ۔ یہ شاہکار نظم موضوعی او معروضی دونوں حیثیتوں سے ایک ایسی ہم آہنگی کا حامل ہے کہ شاعر کی فنکاری اور چابکدستی نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے ۔ موضوع اور ہیئت کے حسین ملاپ نے اسے ایک نہایت جامع اور شعری تجربے کا ایک اعلی نمونہ بنا دیاہے ۔ اقبال کی اس نظم میں شعریت کی بہت سی خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں ۔ رمزیت' رومانیت وکلاسیکیت'

Scanned by CamScanner

تشبیہ واستعارہ اور امیجری کا فنکارانہ استعمال، تغزل کی پر کیف لے، تسلسل بیان جذبات اور حقیت نگاری کا امتزاج ---- ایسی خصوصیت ہیں جو اس نظم میں بابجاملتی ہیں ۔ ان شاعرانہ محاسن کے ساتھ ساتھ اقبال نے اپنے فکری عناصر، فلسفیانہ موضوعات اور زندگی کے بارے میں مثبت نظریات سمو کر اس نظم کو اس آفاقی اور عظیم شاعری کی صف میں لاکھڑاکیا ہے جو بقول ایک نقاد"مسرت کے احساس سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت کے احساس پر ختم ہوتی ہے"۔

اس نظم کے آٹھ بندوں میں مختلف موضوعات کو نہایت شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ بادی النظر میں یہ نظم ایک ایسی غزل سے مشابہ ہے جو آٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس کے ہر شعر میں ایک الگ جہان معنی آباد ہے ۔ لیکن نظم کا غائر مطالعہ اس حقیقت کے قریب تر کر دیتا ہے کہ اس نظم کے تمام بند ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ربط باہم کی کیفیت پیدا کر رہے ہیں ۔ گویا یہ ایک ایسا ڈراما ہے جس کے آٹھ ایکٹ ہیں ہر ایکٹ میں ایک واقعہ (episode) ہے لیکن سب ایکٹ مل کر ایک اکائی بن جاتے ہیں ۔ نظم کا آغاز سلسلہ روزوشب کی وضاحت سے ہوتا ہے ۔ قدیم ترین نظریات کے مطابق زماں (Time) وجود کی حرکی صورت ہے جبکہ مکان (space) وجود کی انجمادی حیثیت ہے ۔ یونانی مفکر زینو کے مطابق زمان لامحدود آنات اور مکان لامحدود نقاط کا مجموعہ ہے ۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست اور مشروط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور مشکل ہے ۔ اصل چیز تو زمان خالص ہے جسکا تعلق ہمارے باطنی اور داخلی احساس کے ساتھ ہے ۔ ہمارے ذہن میں وقت کے گزرنے کا احساس ہوتا ہے ۔ حالانکہ وقت ابدیت کا حامل ہے ۔ یہ ناقابل تقسیم اور ناقابل تسخیر ہے ۔ اس کا آغاز ہے نہ انجام ۔ اس کو قرآن حکیم میں "ام الکتاب" کہا گیا ہے ۔ حدیث میں آتا ہے کہ "زمانے کو برا مت کہو زمانہ خدا ہے" لیکن یہ وقت کا روحانی اور وجدانی تصور ہے ۔ وقت کا ایک مادی تصور بھی ہے جو مادی اشیاء کے لئے ہے ۔ ہم نے اپنی سہولت کے لئے وقت کو

Scanned by CamScanner

تقسیم کرلیا۔ اور اسے پیمانہ امروز و فردا کے ذریعے ناپنے لگے۔

دوسرے لفظوں میں مادی اشیاء کے لئے وقت کا ایک خارجی مظہر یا پیکر ہے جس سے واقعات کا ڈھانچہ ترتیب پاتا ہے اور یہ انسان کے شعور سے اس طرح گزرتا ہے جیسے کوئی دریا پل کے نیچے سے بہتا چلا جاتا ہے پل کے نیچے سے گزرنے والے پانی کی مثال حال کی ہے۔ جو گذر گیا وہ ماضی اور جو پانی آرہا ہے اسے مستقبل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے مفکر اقبال نے مسلمانوں کی عقیدت کے تحت تخلیق ہونے والے شاہکار کو دیکھ کر زمانے کو حقیقت اور ماہیئت کے بارے میں غور کرنا شروع کیا اور شاعر اقبال نے اپنی سوچ کے دھارے کو نہایت دلکش شاعرانہ انداز میں بیان کرنا شروع کردیا۔

سلسلہ ء روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ ء روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلہ ء روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ذات اپنی قبائے صفات
سلسلہ ء روز شب سازازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

گویا ایک طرف سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات ہے تو دوسری طرف غارت گر اشیاء بھی ہے زندگی اور موت وجود کے دو انتہائی نقطے ہیں اور وقت ان علت ہے سازازل کی فغاں کرب تخلیق کا استعارہ ہے جس سے امکانات کا زیرو بم نظر آتا ہے۔

لیکن مفکر اقبال کا ذہن موت و حیات کے فلسفے پر غور کے بعد دو نتائج اخذ کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جو اشیاء کمزور ہیں اور وقت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں وہ تو آنی وفانی اور ناپائیدار ہیں۔ وہ غیر خود سے ٹکرانے کے بعد فنا ہوجاتی ہیں

تجھ کو پر کھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ

Scanned by CamScanner

سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے مری برات
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

لیکن اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو پھر مایوسی ہی مایوسی تھی۔ پھر زندگی کا فائدہ کیا؟ شاعر کی فکر کا دوسرا دھارا وہ ہے جہاں وہ یہ سوچ کر اپنے اندر استقامت پیدا کرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ فن کا یہ معجزہ مسجد قرطبہ کی صورت میں اسی عظمت وجلال اسی شان و شوکت کے ساتھ آج بھی پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آخر وقت کے بے رحم ہاتھوں سے فن تعمیر کا یہ معجزہ کس طرح محفوظ رہا چنانچہ شاعر نے دوسرا نتیجہ یہ نکالا کہ ہر نقش جو عشق کے ہاتھوں ابھرتا ہے رنگ ثبات دوام کا حامل ہوتا ہے کیونکہ عشق کا تعلق زمان خالص کے ساتھ ہوتا ہے جو ابدیت ہے دوام ہے زندگی ہے، عشق کا خمیر بھی اسی سے اٹھا ہے۔ اس لئے بے پناہ طاقت اور قوت کے سامنے زمان مسلسل کی تند و تیز رو بھی مجبور و بے بس ہو کر رہ جاتی ہے

تند سبک سیر گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

اب شاعر عشق کی صفات بیان کرتا ہے۔ یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے اقبال کے یہاں عشق کا لفظ کلیشے کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ عشق خودی کو استوار کرنے والا ایک پرزور اور قوی جذبہ ہے جو تخلیق مقاصد بھی ــــ کرتا ہے اور تسخیر مقاصد بھی عشق زندگی کا جو ہر تکوین و ارتقاء کا سرچشمہ ہے بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان عشق سے اقبال کی مراد وہ جوش وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت

Scanned by CamScanner

رکھتا ہے جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیل ذات کے لئے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتا ہے یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصا مستی۔ انہماک اور جذب کلی ہے اس سے انسانی ذہن زمان و مکان پر اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے اور لزوم وجبر کی دائمی زنجیروں سے چھٹکارہ پاتا ہے"

(روح اقبال)

تیسرے بند میں اقبال اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کے وجود کی پائیداری اور اثبات دراصل عشق ہی کی بدولت ہے مسجد قرطبہ پر ہی کیا موقوف کوئی شکل۔ کوئی صورت کوئی نقش ـــــ چاہے وہ سنگ و خشت میں ملبوس ہو یا سایۂ رنگ میں سے نمودار ہو رہا ہو یا اصوات و الفاظ کا روپ اختیار کرے اس وقت تک حیات ابدی سے سرشار رو ہمکنار نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں عشق کی کار فرمائی نہ ہو۔

فن کے اس جذبے کو جو عشق کی بدولت حرکت پذیر ہوتا ہے اقبال نے "خون جگر" سے موسوم کیا ہے جو عزیز احمد کے خیال میں محض خلوص نہیں بلکہ اس میں فنکار کے تخلیقی جذبے کی پوری کلیت شامل ہے جبکہ اسلوب احمد انصاری کے بقول "خون جگر" سے مراد محض فنی شدت احساس نہیں ہے بلکہ ایک ایسا فنی ہے جذبہ جس میں ایمان و ایقان کی آمیزش پائی جاتی ہے غالب نے اسے "دل گداختہ" سے تعبیر کیا تھا

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

اور رسکن نے اس کے لئے "پر خلوص دل" کی ترکیب استعمال کی۔
اقبال عشق اور فن کے رابطے پر یقین رکھتے ہیں بلکہ سچے فن کی تخلیق کو عشق سے منسوب کرتے ہیں ان کے خیال میں اعلیٰ فنون کے پیچھے خون جگر کی کار فرمائی ہوتی

Scanned by CamScanner

ہے اقبال اعلیٰ تخلیق کو بامقصد (Meaning ful) سمجھتے ہیں اور دو باتوں کو اس کے لئے ضروری تصور کرتے ہیں ایک تو یہ کہ حسن کا تصور پیدا کرے اور مسرت و حظ آفرینی کا جذبہ ابھارے اور دوسرے یہ زندگی کی بلند اقدار اور بصیرتوں کو سامنے لائے۔ گویا اقبال کے نزدیک عشق کا جذبہ محض جبلتوں سے عبارت نہیں بلکہ اس کا تعلق شعوریات سے بھی ہے۔ اور فن میں اس کی کارفرمائی گویا دونوں منصب پورا کرتی ہے

فن کے بارے میں اپنے نظریات اور اس میں خون جگر کی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد اقبال مسجد کی فضا کی دل فروزی اور اپنے کلام کی دلگدازی کو بھی اس سے منسوب کرتے ہیں۔

اقبال کی تیرہ نظمیں

چوتھے بند میں شاعر فن تعمیر کی اس لافانی تخلیق کو مصور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور ایک نہایت نادر تشبیہ کے ذریعے اس کی تصویریوں کھینچتے ہیں۔

تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

اور جب اس کی نظر بلند و بالا مینار پر پڑتی ہے تو اسے اس میں ایک مومن۔ ایک مرد جلیل وجمیل کی جھلک نظر آتی ہے جو سوار اشہب دوراں بھی ہے اور فروغ دیدہ امکاں بھی ۔۔۔ جو رزم میں آہن و فولاد بن کر جاتا ہے اور بزم میں حریر و پرنیاں ہو جاتا ہے جو کوہ و صحرا کو سیل تند و تیز کی طرح چیرتا ہوا گزرتا ہے اور گلستانوں میں جوئے نرم سیر ہو کر بہتا ہے غرض وہ اس کائنات کا حاصل ہے

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمئی محفل ہے وہ

نظم کے پانچ بندوں میں زمان ومکاں۔ عشق، فن اور مرد کامل کے

Scanned by CamScanner

موضوعات پر اظہار خیال کرنے کے بعد شاعر بقول پروفیسر وقار عظیم مرحوم "اپنے فکر و تخیل کی پوری رنگینی سے فلسفہ "تاریخ" الٰہیات اور جمالیات کو ایک ہی حسن کا مرکز اور ایک ہی مقصد کا تابع فرمان بنا کر ایک ابدی اور دائمی رشتے میں جوڑ چکتا ہے تو تصور اسے ان " مردان حق اور شہسواران عرب" کی یاد سے بے چین کر دیتا ہے جنہوں نے اندلسیوں کی سرزمین کو حرم مرتبت بنایا اور جن کی نگاہوں نے مشرق و مغرب کی ترتیب کرکے ظلمت یورپ میں خرد کی شمع روشن کی۔ یہاں اقبال کی نظر تاریخ کے ایک ایسے روشن اور تابناک باب پر جاکر مرکوز ہو جاتی ہے جو مسلمانان اندلس کے چھ سو سالہ عہد زریں کی یادگار ہے" اقبال نے تلمیحات کے ذریعے مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح مذہب' انقلاب فرانس' اٹلی میں قوم پرستی کی تحریک اور آزادی کے حوالے دیئے ہیں اور ان تحریکوں کی بدولت ان اقوام کی بیداری کے آئینے میں ملت اسلامیہ کی بیداری کا عکس بھی دیکھا ہے اس زمانے میں جب یورپ پر ظلمت کا دور (Darkages) طاری تھا اندلس کے دربار میں ابن ارشد' ابن طفیل' ابن ماجہ جیسے عقلی فلسفی خرد افروزی کی تحریک چلا رہے تھے۔ یہ وہ فلسفی تھے جو صدیوں تلک یورپ والوں کے حواس پر چھائے رہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کو اندلس کی سرزمین کا یہ شاندار ماضی بے حد عزیز ہے۔ کیونکہ وہ صحیح اسلامی علوم و اقدار کا امین رہا ہے' لیکن اقبال محض ماضی پرست نہیں ہیں وہ اس شعر کے مصداق کہ

چشم پر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفرنید رفتہ را

اس پوری تاریخ کو چند بلیغ اشاروں میں پیش کرکے ماضی کے احیاء کے امکان پر غور کرتے ہیں کیونکہ انہیں آج بھی اندلس کی ہواؤں میں یمن کی خوشبو اور وہاں کی گفتگو میں حجازی لب ولہجے کی جھلک نظر آرہی ہے

چھٹے بند کے آخری شعروں میں اقبال کی شاعرانہ قدرت اپنی پوری جلوہ سامانیوں

Scanned by CamScanner

کے ساتھ ابھرتی ہے اور تمام فضا کو تغزل کے کیف و گداز میں سمو لیتی ہے۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

نظم کا ساتواں پردہ اٹھتے ہی اقبال ہمیں کچھ فکر مند نظر آتے ہیں وہ جلیل القدر قوم جس کی اذانوں سے کبھی مسجد قرطبہ کی فضائیں گونجا کرتی تھیں آج زبوں حالی کا شکار کیوں؟ کیا اس کے اندر انقلابی روح کبھی بیدارانہ ہوگی؟ لیکن ایک لمحے میں ان کی مایوسی رجائیت میں بدل جاتی ہے۔ انقلاب تو زمانے کا آئین ہے جرمنی فرانس اور اطالیہ کے انقلابات اس حقیقت کی پیش گوئی کرتے ہیں کہ مسلمان بھی اپنی کہن سالگی کے باوجود "لذت تجدید" سے پھر جوان ہو سکتے ہیں چنانچہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں۔

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

مسعود حسین خان کے الفاظ میں

"یہ بشارت مبنی ہے اس خواب پر جو مغربی تمدن کے زوال کی ایک رنگین شام، مسجد قرطبہ کے دامن میں، وادی الکبیر کے کنارے ایک ایسی سرزمین میں جہاں مسلمان نابود ہے، اقبال نے دیکھا ہے۔ ہر خواب ماضی کی صدائے بازگشت ہوتا ہے یہ خواب بھی اجتماعی حافظے کی بعض اہم یادوں پر مبنی ہے اس میں رومان بھی ہے اور خیال بھی۔ تاریخ بھی ہے اور یقین بھی ہے اور سب سے بڑھ کر فتح مبین ہے سلسلہ روز و شب پر، زمان کے سیل بے پناہ پر ہو الغالب! ہوا الغالب!" (اقبال کے فکری آئینے۔۳۲۸)

یہاں پہنچ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظم مختلف مراحل طے کرتی ہوئی اپنے

Scanned by CamScanner

فطری انجام تک پہنچ چکی ہے شاعر کی تخلیقی قوت آسودہ ہو چکی ہے "شیریں دیوانگی" کی کیفیت ختم ہو چکی ہے اور اب شاعر "مقام جنون" سے اتر کر آس پاس کی فضا میں کچھ سکون اور (Relief) حاصل کرنا چاہتا ہے فطرت اسے یہ آرام اور سکون مہیا کرتی ہے اور وہ اس کی تصویریں بنانا شروع کر دیتا ہے۔

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُر سوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہد شباب

یہ تصویریں کتنی دل کش، کتنی رنگین، کتنی مترنم، اور کتنی متحرک ہیں۔ شاعر کے حسن بیان نے فطرت کے حسن میں اپنی تخیلی رنگ آمیزی سے چار چاند لگا دیئے ہیں ایک فن کار یا شاعر مشاہدے کے عمل کے دوران میں جزئیات کائنات کی جن ہیئتوں سے اثر قبول کرتا ہے ان کو وہ اپنے وجدان کی مدد سے کچھ اضافے اور تبدیلی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسی کی بدولت بقول شوپن ہاراس کے فنی کارناموں میں حسن نظر آنے لگتا ہے۔ اقبال نے اپنے حسن بیان کے اعجاز سے ان تصویروں کو نہ صرف سنوارا ہے بلکہ ان کو تغزل کے بھرپور رنگ میں سمو کر پیش کیا ہے۔ منظر کشی کرتے کرتے پیغامبر اقبال کو اچانک یہ خیال آتا ہے کہ ابھی اسے قوم کو اپنا پیغام بھی دینا ہے" آب رواں کبیر" کے کنارے وہ اتنی دیر سے جو خواب دیکھ رہا تھا اس کی تعبیر تو ابھی باقی ہے چنانچہ آخری چند اشعار میں پیغامبر اقبال قوم کو اپنا روح پرور پیغام دیتے ہیں کہ زندگی انقلاب کا دوسرا نام ہے جس قوم میں انقلابی روح موجود نہ ہو وہ زندہ قوم کہلانے کی حق دار نہیں۔ انقلاب اور کش مکش ہی دراصل وجہ حیات ہے مسلمانوں کو بھی یہ کش مکش شروع کرنی چاہیے لیکن اس کے لئے جذبہ عشق کی ضرورت ہے جس کے بغیر کسی نصب العین کا حصول ممکن نہیں پوری نظم اقبال کی فنی صناعی اور فکری تشکیل و تعمیر کا کرشمہ ہے مختلف موضوعات

Scanned by CamScanner

اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتے چلے گئے ہیں کہ نظم بہ حیثیت ایک وحدت یا اکائی کے بھی نہایت کامیاب ہے نظم "بحر مدید" میں کہی گئی ہے جو نئی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ دلچسپ اس لئے کہ پوری نظم کے درمیان میں ایک خط کھینچ دیا جائے تو ہر شعر اور ہر مصرعہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے [۱۵]

سلسلۂ روز و شب　　　نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب　　　اصل حیات و ممات

اسی طرح بلا تخصیص کسی بھی شعر کو لے لیجئے دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ نظم کا لب و لہجہ پر وقار اور پر تجمل ہے لیکن اس میں تغزل کی پر کیف لے بھی شامل ہو گئی ہے۔ مواد اور ہیئت آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں جس طرح پھول میں رنگ و بو تشبیہ و استعارہ اور امیجری کا استعمال مقصود بالذات نہیں بلکہ تاثر آفرینی اور حسن و نزاکت میں اضافے کا باعث بنا ہے غرض اگر بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان "اقبال کا آرٹ دلوں کو لبھانے کے طلسم میں پوشیدہ ہے تو یہ نظم اس طلسمی آرٹ کا نقطۂ کمال ہے۔

ڈاکٹر این میری شمل

ترجمہ و تلخیص ــــــ ڈاکٹر اے بی اشرف

روڈولف پان وچ اور اقبال

پان وچ ــــ جرمنی کے مشرقی حصے میں واقع ایک شہر کر اسن میں پیدا ہوا جو برلن سے زیادہ دور نہیں ہے ۔ اس کے والد ایک سکول ٹیچر تھے ۔ پان وچ لڑکپن ہی سے یونانی ۔ اسیریائی (ASSYRIAN) اور نارڈک (NORDIC) ادب میں دلچسپی لینے لگا اس کے چچا ایڈورڈ سیلر نے جو لاطینی امریکہ کے مایائی کلچر (MAYA) کا ماہر مانا جاتا تھا اس کے سامنے نئے افق ہویدا کئے ۔ لیکن اس مختلف الحیثیات نوجوان پان وچ کا سب سے بڑا شوق یہ تھا کہ وہ ایک شاعر بن جائے اور حقیقتاً" شاعری ہی ساری زندگی اس کا مقصد بنی رہی ۔

ڈاکٹر این میری شمل کے خیال میں پان وچ کی شاعری بہت مشکل ہے اور اس میں شعریت کی کمی ہے کیونکہ وہ جرمنی کے قدیم تاریخی واقعات سے بوجھل ہے اور اس میں فلسفے کی اتنی بھرمار ہے کہ وہ عظیم شاعری کے زمرے میں نہیں آتی ' بر خلاف علامہ اقبال کی شاعری کے جو نہ صرف آسانی سے یاد ہو جاتی ہے بلکہ اپنے ترنم اور جوش و جذبے سے سننے والے پر وجد طاری کر دیتی ہے ۔ پان وچ کے کلام کو تو خصوصی لے ۔ اور بہت آہستگی سے پڑھنے کی ضرورت ہے

Scanned by CamScanner

... کا رابطہ شٹیفن جارج کے ساتھ قائم ہو گیا جو جرمن شاعری میں ایک مخصوص کلاسیکی رجحان کا سرخیل تھا پان وچ ماربرگ میں جرمنی علم اللسان۔ فلسفے اور علم آثار قدیمہ کا طالب علم تھا' ماربرگ جنگ عظیم اول سے پہلے علم و دانش کا ایک عظیم مرکز تھا۔ پھر اس نے برلن میں اپنی تعلیم جاری رکھی ۱۹۰۳ء میں اسکی ملاقات اوتو زرلنڈ کے ساتھ ہوئی جو انتہائی درجے کا فطرت پرست تھا۔ اس نے شٹیفن جارج سے پان وچ کا رابطہ چھڑا دیا۔ ان کے ملنے نے چرون (CHARON) کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا' آج اوتوز رلنڈ کو فراموش کر دیا گیا ہے حالانکہ اس کی کئی نظموں میں تمثال آفرینی اور ردم کا اعلیٰ ترین حسن موجود ہے

اسی دور میں پانوچ کا برٹلڈ اوٹو کے ساتھ رابطہ قائم ہوا جو بیسوں صدی کے آغاز کا ایک نہایت اہم معلم تھا۔ وہ تعلیم کے اس نظریئے کا حامی تھا۔ کہ طالب علموں کے لئے نامیاتی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے اور ان کے لئے دیہاتوں میں اقامتی درس گاہیں قائم ہوں جہاں ان کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکے نہ کہ انہیں خشک حقائق اور صرفی و نحوی اصول رٹنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ پان وچ اوٹو کے انقلابی نظریات سے بے حد متاثر ہوا اور دونوں کے تعلق کا یہ نتیجہ نکلا کہ اوٹو نے اپنی بیٹی پان وچ سے بیاہ دی خود پان وچ نے تعلیم کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں اس کی نظموں نے بھی بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا چنانچہ ان لوگوں میں این ہالٹ کا شہزادہ ہرزوگ بھی تھا جس نے پان وچ کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا اور اس نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۵ء کا عرصہ عظیم رزمیہ نظمیں (EPICS) لکھنے میں گزارا۔ یہ اپنے زمانے کی بڑی انقلابی نظمیں تھیں لیکن اب تو جرمن ادب کے طالب علموں تک نے انہیں بھلا دیا ہے

پہلی جنگ عظیم کے دوران ۱۹۱۵ء میں اس نے جنوبی ٹرول میں بودوباش اختیار کر لی۔ یہاں ایک طرف تو اس نے طبعی علوم کی طرف توجہ دی دوسری

Scanned by CamScanner

طرف اسے عمرانیات اور عمرانی فلسفے میں شغف پیدا ہوا۔ البتہ اس کی شاعرانہ سر گرمیوں کا اہم نتیجہ آسٹریا کے شاعر ہیوگر ہوف مینس تھال کے ساتھ دوستی کی صورت میں نکلا جو بیسویں صدی کے اعلی ترین ادیبوں میں سے تھا۔ اسی کشش نے اسے پریگ جانے پر مجبور کر دیا یہاں وہ چیکو سلاو کیائی (CZECHS) ثقافتی سرگرمیوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ایک نہایت اہم مضمون (THE SPIRIT OF THE CZECHS) کے عنوان سے قلم بند کیا۔

جنگ کے بعد وہ بحیرہ روم کے ساحل پر واقع جنوبی دلماتیہ میں قیام پذیر ہو گیا یہاں کے حسین مناظر اس کی بہت سی شاعرانہ تخلیقات کے محرک بنے اس کی نظموں میں یہاں کے گلستانوں، زیتون کے درختوں، پہاڑوں اور سمندری لہروں کا ذکر بڑے تواتر کے ساتھ ملتا ہے اسی دور میں اس کا رابطہ اپنے ہم عصر شعراء کے ساتھ بھی رہا خاص طور پر ان شاعروں کے ساتھ جن کا رجحان اساطیری فکر کے احیاء کی طرف تھا جیسے الفریڈ موبرٹ (Flemish) زبان کے شاعر دردے اور نہایت توانا اظہار کے جرمن ادیب ارنسٹ دلف سکیل وغیرہ

۱۹۳۳ء میں اس نے ہٹلر کی وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا جس پر اسے پرشیا کی سائنس اکادمی سے نکال دیا گیا اور اس طرح اسے اپنی معمولی لیکن باقاعدہ آمدنی سے محروم ہونا پڑا۔ آخر کار ۱۹۴۸ء میں اس نے والماتیہ کو بھی خیرباد کہہ دیا کیو نکہ یوگو سلادیہ اب ایک سوشلسٹ ریاست بن چکی تھی چنانچہ پان وچ نے اپنے ان دوستوں اور مداحوں کی دعوت پر سوئیٹزرلینڈ میں سکونت اختیار کر لی جن میں اس کی دوسری بیوی (HERMANN HESSE) بھی شامل تھی جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھی اور نہ صرف اس کی زندگی میں بلکہ اس کے بلند خیالات میں بھی شریک بنی اوودروکسر UDO RUKSER --- جس نے دور جدید میں پان وچ کو ہم سے متعارف کرایا، کہتا ہے

"بطور شاعر، ادیب، نقاد اور مفکر کے پان وچ نے دو خود کو [illegible]

وسعت اور گہرائی کی بدولت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جو ہمارے عصری منفرد اور بے مثال یادگار ہے۔"

پان وچ کی تصنیفات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی حیرت زدہ کر دینے کے لئے کافی ہے۔ شاعرانہ کلام کے علاوہ اس کی کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے ایک طرف تو اس نے مشرق و مغرب کی سیاحت پر چھوٹے چھوٹے کتابچے لکھے دوسری طرف انکار پسندی' ترقی پذیر دنیا اور فطرت کا ڈھانچہ پر کتابیں موجود ہیں۔ فطرت کا ڈھانچہ

(THE STRUCTRE OF NATURE

NIHILISH S.THE DEVELOPING WORLD

CONTRIBUTION TO A EUROPEAN CULTURE

اس کے علاوہ متنوع موضوعات پر اس کے مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ ملتا ہے۔ ان موضوعات میں بین الاقوامی قانون زردشت' ینگ' (نفسیات) مصور کلاڈے لوریاں 'مہابھارت' شکنتلا پر مضامین کے ساتھ ساتھ گوئٹے اور دانتے کا عمیق مطالعہ' عالمی سیاست فلسفہ طبیعات انگریزی شاعری' معاشرتی انصاف کی حمایت اور کمیونزم کے خلاف مضامین شامل ہیں۔

۱۹۵۷ء میں وفاقی جمہوریہ جرمنی نے پان وچ کو شلر پرائز سے نوازا اور مشرقی جرمنی نے اسے انڈیا رس گرافیس پرائز عطا کیا عمر کے آخری حصے میں پان وچ بہت زیادہ حساس اور جذباتی ہو گیا اور اس نے بیشتر دوستوں سے تعلقات توڑلئے اور اپنی زیادہ تر توجہ اپنے فلسفیانہ کاموں پر مرکوز کر دی جس نے اسے تادم آخر مصروف رکھا اودرو کسرنے درست کہا ہے کہ

"خود پان وچ کے نزدیک تقریب سے برتر لیکن مشکل اور کم یاب ...کمال دست گاہ بہم پہنچائی"

(۲)

پان وچ کے افکار کو چند جملوں میں کشید کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ایک پاکستانی قاری کے لیے ان چند مسائل پر توجہ مرکوز کرنا دلچسپی کا باعث بنے گا جو پان وچ اور اقبال میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ مثلاً" سب سے پہلے ہم مادہ اور توانائی کا مسئلہ لیتے ہیں۔ پان وچ مادہ کو مخفی توانائی اور توانائی کو مادہ میں چھپی ہوئی طاقت خیال کرتا ہے۔ دونوں حالتیں مسلسل تبدیلی کے عمل میں ہیں اور زندگی میں دھڑکن پیدا کر رہی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ پان وچ تغیر پیہم میں یقین رکھتا ہے جسے اقبال شاعرانہ الفاظ میں خلوت اور جلوت کا نام دیتا ہے اقبال نے اسے جاوید نامہ میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے پان وچ اس تصور کو پوری کائنات پر پھیلا دیتا آتا ہے جسے ابن عربی نے زیادہ نمایاں طور پیش کیا ہے کہ دنیا خدا کی سانس ہے جو مستقل طور پر وجود 'عدم وجود' کی حالت میں رہتی ہے۔

جگہ یا مکان پیائش سے پہلے بھی معیار رکھتے تھے۔ پان وچ کے نزدیک کسی شے یا مظہر کی کیفیت یا کمیت کی اس عضوی وحدت کو ظاہر کرتے ہیں جو مسلسل متحرک اور متغیر رہتی ہے اسی کے ذریعے مادے میں تبدیلیوں کی پیائش ہوتی ہے اور

اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت ایک ذاتی تجربہ ہے اور ہر شخص بلکہ ہر مخلوق وقت کا ایک اپنا تجربہ رکھتی ہے۔ اقبال نے "جاوید نامہ" اور کئی اور جگہوں پر اسے "وقت کی زنار" کہا ہے۔ یہ ایک ذاتی زنجیر (سلسلہ) ہے جس میں وہ فرد داخل دے سکتا ہے جو اس لمحے تک پہنچ چکا ہو جس کا ذکر حدیث میں یوں آیا ہے کہ۔

"لی مع اللہ وقت" (ترجمہ:- میرا خدا کے ساتھ وقت ہے)

جب روڈولف پان وچ نے اقبال کے لیکچر' جاوید نامہ اور پیام مشرق کے تراجم (جو ڈاکٹر این میری شمل نے کئے ہیں) پڑھے تو یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی حد نہ رہی کہ ایک مسلمان مفکر نے نطشے کو کتنے صحیح انداز میں سمجھا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

Scanned by CamScanner

"جہاں کہیں وہ (اقبال) نطشے کو دیکھتے ہیں صحیح تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے نطشے کو اس انداز میں دیکھا ہے۔"

پان وچ خود بھی نطشے سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے۔

"جب میں ایام شباب میں نطشے سے شدت کے ساتھ متاثر اور متحرک ہوا تو میرے دل میں یہ سوال ابھرا کہ آیا میں (خواہ کتنے چھوٹے پیمانے پر سہی) نطشے کے فکری تقاضوں کے مطابق عمل کر بھی سکوں گا یا نہیں لیکن میں نے نہ سوچا کہ عمل کرنا تو رہا ایک طرف کیا میں اس کے خیالات کا متحمل بھی ہوں سکوں گا یا نہیں؟"۔

پان وچ نطشے کو ایک المیاتی مفکر (TRAGIC THINKER) سمجھتا ہے۔ جس نے اپنے عصر کے عوارض کا تجزیہ کیا لیکن جیسا کہ وہ خود (پان وچ) لکھتا ہے۔

"نطشے کی بے پایاں قناعت اور روح کی شدت نے آخر کار ظرف کو توڑ دیا"۔

اس سلسلے میں ہمارا ذہن خود بخود حلاج اور نطشے کے اس موازنے کی طرف مبذول ہو جاتا ہے جو اقبال کے کلام میں نظر آتا ہے۔ "تنگ ظرفی"(۴) کا روایتی اظہار جو عموماً" نقشبندیہ کی طرف سے حلاج کے لئے کیا جاتا ہے۔ جرمن فلسفی پان وچ نے نطشے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اقبال کا "مجذوب فرنگی" بھی فوراً" ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے۔

پان وچ کے مطابق نطشے نے زندگی کا صحیح فلسفہ پیش کیا ہے۔ وہ نطشے کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وہ (نطشے) ایک ایسا منکر خدا نہیں جو اپنے پرانے خالق کی تلاش میں ہو بلکہ اس کا غالب تخیل خدا کے عام تصور کی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے کسی نئے خدا کا تصور دینے کی بجائے اس وسیع ترین خلا کی دھجیاں بکھیر دیں جو خدائے مطلق کے بارے میں ہماری آگہی میں موجود ہے"۔(۰

چنانچہ اس کے مطابق نطشے ایک مثبت اور تخلیقی انکار پسندی (CREATIVE NIHILISH) کا ترجمان ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اقبال پیام مشرق میں فرماتے ہیں۔

قلب او مومن دماغش کافراست

اور پھر اقبال خود حاشے میں اس کی تشریح بھی کر دیتے ہیں کہ "نطشے نے مسیحی " ، اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔ اس کا دماغ اس واسطے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے مگر بعض اخلاق نتائج ٹیں اس کے افکار اسلام کے بہت قریب کے ہیں"۔

پان وچ جو انسان کے مستقبل کے بارے میں سخت متفکر تھا نطشے کے فوق البشر کے بارے میں لکھتا ہے۔

"مادی وجود کی خود احتسابی کے عمل کے بعد، جو اس کی موجودہ ذات (مادی) کی مکمل نفی کر دیتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے تمام اصلی سرچشموں کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور وہیں سے فیضان حاصل کرنا چاہیے۔ پھر اسے چاہیے کہ وہ اپنی روحانی صلاحیتوں کو منظم کرے اور اپنی تخلیق نو کے ذریعے ایک ایسی ہیئت میں ڈھال دے جو ایک غالب پیکر کی صورت میں اپنی اکمل ترین نمائندگی کرتے ہوئے ایک ایسا فوق البشر بن جائے جو پوری کائنات کے مساوی ہو --- یہی فوق البشر حقیقی ہے بشرطیکہ ہم اس عمل کو سمجھ سکیں جو اس کی اندرونی توانائیوں کے حصول کا سبب بنا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو سفلی خواہشات سے مسلسل برسرپیکار رکھ کر ترقی دینی چاہیے یہاں تک کہ وہ اکملیت کے اس درجے پر پہنچ جائے جو نفسیاتی تناظر میں صوفیا کے اور اقبال کے "مرد مومن" اور "مرد خدا" سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ نطشے کے فوق البشر کی ایک ایسی تشریح ہے جو عام طور پر کی جانے والی تشریح سے بہت مختلف ہے۔ اب یہ مورخین فلسفہ پر چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ حقیقت کا تعین کریں لیکن بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ اقبال اور پان وچ کی فکر میں مماثلت موجود ہے۔

Scanned by CamScanner

(۳)

پان وچ کے مرکزی خیالات وہ ہیں جن کا تعلق زندگی اور انسان کے ساتھ ہے اور یہاں پھر اقبال اور پان وچ کے خیالات میں حیرت انگیز مماثلت موجود ہے۔ پان وچ کا مرکزی موضوع "فرد" اور "آزادی" ہے۔ اس کے مطابق آزادی کا تعلق فرد سے ہے اور یہ اتنی ہی عظیم اور برتر ہو گی جتنی انفرادیت۔

وہ کہتا ہے۔

"چونکہ ہر زندگی میں سب سے ابھرتا ہوا رجحان غلبے کا رجحان ہے۔ اس لئے ہر ارتقاء کا مقصد بلند تر درجے پر پہنچنا ہے اور بلند ترین مدارج کا مقصد حتی الامکان عظیم ترین ضمیر، انفرادیت اور آزادی کا حصول ہے"۔

اسی لئے تو پان وچ "آرزوئے قوت" کو مادی یا مادیت سے متعلق نہیں گردانتا بلکہ اسے بلند اور ارفع مدارج تک پہنچنے کی روحانی خواہش پر محمول کرتا ہے۔ کیونکہ زندگی میں فی ذاتہ آگے بڑھنے کا رجحان ہوتا ہے اس لئے اگر محض ایک بار بھی اس میں ذرا سی کمی واقع ہو جائے تو وہ کسی نہ کسی نقطے پر جا کر ختم ہو جائے گی۔ بہرحال زندگی اپنے آپ کو حرکت سے قائم اور نامیاتی بنیاد پر سرخوش و سرمست رکھتی ہے۔ چنانچہ اس طرح یہ اپنے آپ کو مسلسل برقرار رکھتی اور بڑھاتی رہتی ہے۔ پان وچ جانتا ہے (اور یہی اس کا مرکزی خیال بھی ہے) کہ معمولی صلاحیتیں بلند تر صلاحیتوں میں ضم ہو جاتی ہیں تاکہ نئی اور تکمیل یافتہ صلاحتیں جنم لے سکیں۔ یہاں مولانا روم کا مشہور مصرعہ یاد آتا ہے کہ۔

از جمادی مردم و نامی شدم

اسی مصرعے کو اقبال نے اپنے اس نظریے کے حق میں استعمال کیا ہے کہ ہر وہ چیز جو تخلیق ہوتی ہے مسلسل آگے کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ مولانا روم کی بار بار کی یہ تنبیہہ دوسرے شعراء کے لئے بھی تقلید کا باعث بنی کہ سکون کا ایک مختصر ترین لمحہ

Scanned by CamScanner

(جب نمو رک جائے) بالآخر موت کا باعث بن جاتا ہے۔ اقبال نے بھی اس تصور کو اپنا کر پیہم جستجو کا نظریہ پیش کیا اور منزل کی راہ میں رک جانے کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا۔ وہ اپنی روح کے شتر کو بار بار یہ مصرعہ دہرا کر بے کار مہمیز نہیں دیتے کہ۔

تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

مسلسل ارتقاء اور آگے بڑھنے کے رجحان کے ذکر میں ہمیں یاد آتا ہے کہ:۔

"خارجی ارتقاء اسی حد تک ممکن ہوتا ہے جہاں تک داخلی تناؤ اس کو ساتھ لے کر چلے۔ ہر فرد کی اپنی فطرت ہوتی ہے جو اسے وہ بتاتی ہے جو کہ وہ ہے۔ طاقت کی مکمل، آخری اور حتمی حد ---- جس پر یہ ختم ہوتی ہے --- ختم ہونے سے پہلے ایک نئی ہیئت میں بدل جاتی ہے"۔

اقبال ایک ایسے ممکنہ انسانی ارتقاء اور قوت کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی بھی صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو خواہ وہ جسمانی موت ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی چیز خواہ کتنی کوشش کیوں نہ کرے دوسری چیز کا متبادل نہیں ہو سکتی یہاں ہمیں مولانا روم کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ کسی گدھے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ گھوڑے جیسا کام کرے یا گائے کو پر لگ جائیں۔ ہر چیز کو خود اپنی جگہ پر اپنے امکانات کے مطابق مکمل ہونا چاہیے۔

اس آفاقی نقطہ نظر سے ایک انسان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اہرام (ارتقاء) کا نقطہ کمال ہے۔ اور اپنی کلیت میں کیفیتی طور پر ان اجزاء کے حاصل جمع سے مختلف ہے کہ جن سے یہ متشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ذی روح ایک نئی اور بے مثال شے ہے اور اپنی تفصیلات کے اعتبار سے ایک پر اسرار پیداوار بھی ہے۔ چنانچہ جتنی کوئی مخلوق اونچی سیڑھی (ارتقاء کی) پر کھڑی ہے اتنی ہی اپنی ساخت کے اعتبار سے پیچیدہ ہے۔ مثالی مکمل انسان وہ نہیں ہے جو اپنے آپ میں تمام سابقہ مدارج جمع کر لیتا ہے بلکہ وہ ہے جس کی فطرت میں وہ تمام مدارج ضم ہو جائیں اور وہ ایک ایسی بلند وحدت پر پہنچ جائے جو نئے لائحہ عمل کو تشکیل دے، اس میں بطور انسان پوری ہو کر تکمیل پائے اور ایک

Scanned by CamScanner

ارفع اکائی کی صورت اختیار کر لے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پان وچ انسان کو تمام چیزوں کا معیار تصور کرتا ہے۔ کیونکہ وہی اس کے آج تک کے ترقی یافتہ کلچر کا حامل ہے اور وہی اس کی ان ثقافتی اقدار کا محافظ بھی ہے جن کو ضائع کرنا گویا ہر چیز سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔ وہ ایک نہایت خوبصورت علامت کے ذریعے' جو اس نے ایک قدیم کہاوت سے لی ہے' کہتا ہے کہ انسان محض گوشت بھری ہڈیوں کا مجموعہ نہیں ہے جسے دنیا میں پھینک دیا گیا ہو بلکہ وہ تو ہزاروں سال پرانا گلاب کا پودا ہے جو اس دنیا کا حصہ ہے اور اس دنیا سے وابستہ ہے جس میں وہ اگتا ہے اور جتنا زیادہ پھلتا چلا جاتا ہے اتنا ہی اس کائنات سے اس کا ربط بڑھتا جاتا ہے۔ گویا ایک مثالی انسان اس بڑے نرل یا بلور کی مانند ہے جس میں تمام سابقہ مذاہب' تمدن' فنون' الغرض تمام سابقہ انسانی ترقی کے عہود اور ادوار صورت پذیر ہوئے ہیں۔ اگر ہم مذہبی اسلامی اصطلاح استعمال کریں تو ہم "ختم نبوت" کا مکمل عکس یا (ثنی پائیں گے جو پچھلے تمام ادوار کی تکمیل ہے۔

ہر ذی روح مقصدی قانون جبلت (ENTELECIA) کا پابند ہے۔

اس لفظ کو پان وچ نے ایک خوبصورت جرمن اصطلاح "INNEZIEL HABUNG" میں ترجمہ کیا ہے جس کا ایک باطنی مقصد ہوتا ہے۔ لیکن اعلیٰ مدارج کی طرف ارتقاء اسی طرح بے لگام نہیں جس طرح کسی پھوڑے یا گھاس کا اگنا اور بڑھنا۔ بلکہ اس کا دارومدار زیادہ تر انسان کی قوت ارادی اور اپنے آپ کو خارج سے محدود کرکے باطنی ارتقاء کی طرف منتقل کر لینے کی اہلیت میں ہے۔ ظاہر ہے یہ مادی نصب العین کے خلاف ہے۔ دراصل پان وچ حتی الامکان اس انسان کو کمتر سمجھتا ہے جو مکمل طور پر کسی فلاحی مملکت کے سہارے زندہ ہو۔ علامہ اقبال بھی اسی نقطہ نظر کے حامل ہیں کہ انسان مکمل "فقیری" کی حالت میں بھی خود اپنے وسائل پر انحصار کرے نہ کہ دوسروں کی فیاضی کا دست نگر رہے کہ وہ اس کی کفالت کریں۔ اپنی توانائیوں کو روحانی ترقی میں منتقل کرکے ہی ایک انسان اس منزل پر پہنچ

سکتا ہے۔ جس کو پان وچ "اخلاقی تغیر" سے موسوم کرتا ہے اور جو انسانی تکمیل کا امکانی راستہ ہے۔

اس موقعہ پر یہ مفکر ہمارے عہد کی عظیم شخصیات سے ملاقات کے بعد اپنے اس جدید لیکن مکمل انسان کے فرائض کا تعین کرتا ہے۔ کیونکہ ایٹمی توانائی کی وجہ سے تمام اقوام کے نیست و نابود ہونے کا جو خطرہ ہے۔ وہ اس کے خلاف بزد آزما ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"یہ پختہ کار انسان اپنی دنیا میں خود مختار طور پر بھاگتے ایٹم کے ذرات کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ سب سے پہلے تو وہ اپنے آپ پر اور اپنی پیدا کردہ چیزوں پر قابو پائے گا اور دوسرے یہ کہ اپنی سائنسی تحقیق میں دھماکے دار قوتوں کے پیچھے نہیں دوڑے گا بلکہ زندگی کی بلند سے بلند تر قوتوں اور توانائیوں کو تعمیر کرنے کی کوشش کرے گا۔ تعلیم کا ایک پرانا قانون ہے کہ بودے پن اور لچرپن کو ممنوع قرار دینے سے ان پر قابو نہیں پایا جا سکتا بلکہ توجہ اور دلچسپیوں کو کسی بلند تر چیز کی طرف مائل کرنے سے ان کو برتر بنایا جا سکتا ہے۔"

یہ جملے پان وچ کے ایک فکر انگیز مضمون میں درج ہیں اور یہ ہو بہو قدیم صوفیانہ دانش سے مطابقت رکھتے ہیں کہ انسان کو سب سے پہلے اپنی روح کو صقیل کرنا چاہیے۔ پھر مکمل طور پر خدا کی مرضی کے تابع ہو کر وہ ایسی طاقت حاصل کرے گا کہ ہر شے جو مخلوق ہے اس کے حکم کے تابع ہو جائے گی۔ رومی اور اقبال کی پسندیدہ حدیث یعنی "اسلم شیطانی" (میں نے اپنے شیطان کو مسلمان بنا لیا) کا یہی مطلب ہے کہ انسانی صلاحیتوں کو روکنے سے نہیں بلکہ اعلیٰ تر مقاصد کے حصول اور مثبت اقدار کی تخلیق کی طرف مائل کرنے سے صقیل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نفس یا اس کا شیطان اس کے آگے اس طرح مغلوب ہو جائے گا جس طرح اقبال کا ابلیس انسان کامل کے آگے اس کے ہاتھوں تسخیر فطرت کے بعد سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ حالانکہ شروع میں یہ (ابلیس) غیر پختہ آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

Scanned by CamScanner

یہ تو ممکن ہے کہ آگے بڑھتے وقت قوت حاصل کرنے کے لئے ماضی سے رجوع کیا جائے۔ (۵) لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ فطرت اور روح کی ترقی کو پیچھے لے جایا جاسکے جیساکہ رومی نے کہا ہے۔

ہیچ آئنہ دگر آہن نشد
ہیچ نانی گندم خر من نشد

(آئینہ کبھی پھر سے لوہا نہیں بن سکتا اور روٹی کبھی گندم نہیں بن سکتی)

پان وچ اچھی طرح جانتا ہے کہ انسان مقصد کے حصول میں خطروں سے گھرا ہوا ہے۔ انسان نے اپنی آزادی اور سائنس میں برتری ثابت کر دی ہے۔ دوسری کوئی مخلوق ان دونوں چیزوں میں اس کے مقابل نہیں آسکتی۔ وہ مخص جوان دونوں (آزادی اور سائنس) سے مزین ہے اپنے رجحان کے مطابق یا تو جنت کا فرشتہ ہے یا جہنم کا--- پان وچ سائنس کو ہر دو خوبیوں اور خامیوں کا حامل سمجھتا ہے ---- یہ تعمیری بھی ہے اور تخریبی بھی ---- وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جہنم سے متعلق تمام روایتوں کی بنیاد میں یہ بات شامل ہے کہ سائنس کے تمام عالم اس میں بھرے ہوں گے (فاوسٹ بھی مستثنیٰ نہیں ہے) غیر مطمئن محقق اور عالم جادوگر بن جاتا ہے اور جادوگر عیاش یا مجرم بن جاتا ہے کیونکہ آزاد سائنس ایک ایسی چیز ہے جو نہ تو کبھی مکمل ہوتی ہے اور نہ اس کی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ اپنے ہی کھنڈروں پر آگے بڑھتی ہے یہ اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے نقوش پا کو مٹاتی چلی جاتی ہے۔ انسان کو کوئی متبادل نظریہ دیئے بغیر سابقہ نظیرے کی تردید کر دیتی ہے۔ تجزیہ کرتے وقت یہ اشیاء کا تیاپانچا کرکے رکھ دیتی ہے۔ پان وچ کے مطابق جدید تحلیل نفسی میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ خالص سائنس نہ صرف خطرناک ہے بلکہ تخریبی بھی ہے۔

ان خیالات کے بعد کیا ہمارا ذہن فوراً" اقبال کے مجموعے "پیام مشرق" کی نظم "محاورۂ علم و عشق" کی طرف منتقل نہیں ہو جاتا جس میں تجزیے اور عشق پر مبنی ترکیب کے ضروری تعاون پر زور دیتے ہوئے عشق سے کہلواتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

خلوت خانہ لاہوت زادی
ولیکن در نخ شیطان فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستان ساز
جہان پیر را دیگر جواں ساز

پان وچ اس خطرے سے بھی آگاہ ہے جو اس جدید انسان کو درپیش ہے جس نے آفاقی نقطہ نظر کھو دیا ہے۔ ماضی میں وہ مقررہ اصولوں کی حامل کائنات پر یقین رکھتا تھا۔ جس کے ساتھ اس کا تعلق معلوم تجربات کے مطابق تھا۔ لیکن سابقہ چند دہائیوں کی سائنسی ترقی نے اس کو بے شمار نئی نئی ایجادات سے دوچار کر دیا ہے کہ جن کو فی الحال وہ اپنی کائنات سے ہم آہنگ نہیں کر سکا۔ یورپین ماہرین آثار قدیمہ کی کھدائی نے ایسی تہذیبیں ہمارے سامنے کر دی ہیں جن کے بارے میں پہلے ہم کچھ نہ جانتے تھے لیکن اب وہ ہمارے درمیان موجود ہیں اور جیسا کہ ایک مفکر نے کہا ہے کہ ہماری زندگی کی خالی جگہیں ان لاتعداد مافوق الفطرت مخلوقات' سایوں اور بھوتوں سے بھر گئی ہیں۔ کیا ہمیں اقبال کی آواز سنائی نہیں دیتی جب وہ "جاوید نامہ" میں ان قدیم دیویوں کا تصور کرتا ہے جو جدید علم الاثار کی مدح کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کیونکہ اس نے صدیوں کی نیند سے نجات دلا کر انسانی زندگی میں داخل کر دیا۔ تاکہ اب وہ توحید پرست مذاہب کی سادہ اور بلند بانگ تعبیروں کے خلاف بزد آزما ہو سکیں لیکن پان وچ جانتا ہے کہ ایک عبوری وقفہ ہے۔ انکار پسندی نئی دنیا کی طرف پہلا قدم ہے جیسا کہ اقبال صوفیانہ روایت کی تقلید میں الا الله کے درجے تک پہنچنے کے لئے ابتدائی طور پر لا کو لازمی تصور کرتے ہیں۔

اشیاء کی مثالی حالت تک رسائی' کے لئے دوسرے لفظوں میں مثالی انسان تک رسائی کے لئے ہر چیز کو راستے سے ہٹانا ہوگا جو تخلیقی صلاحیتوں کو سلب کرے اور جب ایک مثالی معاشرے کی تمنا کی جاتی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ فرد کی اپنی بنیادیں نہایت مضبوط ہوں۔ رموز بے خودی سے پہلے اسرار خودی سے آگاہی لازمی ہے۔

پان وچ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا کہ کوئی ایسا آفاقی نقطہ نظریا فلسفہ

پیش کرنا تقریباً" ناممکن ہے جو تاریخ کے تمام ادوار پر یکساں صادق آئے پان وچ کا نظریہ ہے کہ ہر دور کی ایک اپنی "روح" ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ بالکل اس چھلنی کی طرح جس کے مخصوص سوراخ مخصوص چیزوں کے لئے تو مناسب ہوتے ہیں جبکہ وہ دوسری چیزوں کے لے موزوں نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے آفاقی نظریات ایک دوسرے کے ساتھ ایک مخصوص پس منظر کے تعلق سے مربوط ہیں اور وہ تمام مل کر ایک آخری وحدت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ہر ایک اس وحدت تک اپنے مخصوص انداز میں رسائی حاصل کرتا ہے ---- یہاں ہمارے ذہن میں ابن عربی کا وہ خیال بھی آتا ہے کہ خالق کائنات کا مقصد "رب" در حقیقت اس کے "مربوب" سے منسلک ہے اور جو ایک الوہی صداقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی سے دو افراد خدا تک پہنچنے کے لئے ایک سا راستہ اختیار نہیں کرتے۔ اس تناظراتی کائنات میں انسان اپنی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی حدوں کو چھو لیتا ہے اور خود کو اس کائنات کا، جو محض اس کی اپنی ہے، مرکز تصور کرتا ہے۔

یہاں قاری یہ پوچھ سکتا ہے کہ پان وچ خدا کا تذکرہ کبھی نہیں کرتا کیوں؟ اس سلسلے میں بات یہ ہے کہ وہ ایک فلسفی ہے نہ کہ ماہر دینیات۔ لیکن یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اس کا فلسفہ دینیات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے کیونکہ وہ مذہب کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ یہ بات اس کے ۲۳ جون ۱۹۶۳ء کے لکھے ہوئے ایک خط سے (جو ڈاکٹر شمل کے نام ان کا "مطالعہ بال جبرئیل" پڑھ کر لکھا گیا تھا) ------ مکمل طور پر عیاں ہو جاتی ہے جس میں وہ کہتا ہے۔

"جب آپ ہر چیز کو مذہب کے ساتھ جوڑ دیں گے تو آپ کو ایک کل نظر آئے گا کیونکہ اس کل میں مذہب سرائیت کئے ہوتا ہے اور اس میں ممکنہ حد تک اپنے انکشاف کے لئے وسیع گنجائش ہوتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے کوئی چیز نہ تو مذہب سے باہر ہوتی ہے اور نہ تنہا ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہ سب ایک دوسرے کے انتہائی قریب ہے"

۱۴ دسمبر ۱۹۶۱ء کے ایک خط میں اس نے لکھا۔

Scanned by CamScanner

"میں سمجھتا ہوں کہ مطابقت (میرے اور اقبال کے درمیان) خوب ہے۔ خصوصاً" خودی کے مکمل ادراک میں' جو خود اس کی داخلی فضلیت کا نتیجہ ہے اور جو متصوفانہ نہیں ہے"۔

پان وچ نے جس چیز کو ضروری سمجھا وہ یہ تھی کہ۔

"مشرق اور مغرب ہر چند کہ ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں ضروری نہیں کہ یہ پلیٹ فارم نام نہاد "بین الاقوامی پلیٹ فارم" ہی ہو مشرق میں اقبال نے بالکل وہی کیا جو میں خود کرنے کی خواہش کر سکتا ہوں۔ لیکن فیصلہ کن امر یہ ہے کہ جو کچھ اقبال نے مشرق کے لئے کیا ہے وہ مشرق کی روایات میں پوری طرح ڈوب کر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کے لئے اقبال کے ثمرات بہت زیادہ ہیں اور ہم سب کے لئے ایک نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں"۔

میرا خیال ہے ". میں اقبال اور پان وچ کو بہتر خراج تحسین پیش نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ آپ کو وہ تعریف نہ بتا دوں جو پان وچ نے اپنی نظم (ZEITGEIOHT) کے بارے میں کی ہے۔ جس کا لکھنا اس کی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تھا۔ وہ کہتا ہے اور یہ بات اقبال کی شاعری پر پوری طرح صادق آتی ہے کہ:۔

"ہر عظیم شاعری اپنے دور کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے وقت سے ماوراء بھی ہوتی ہے۔ یہ وقت کو مکمل کرتی۔ اس کی تہوں کو کھولتی' اس کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتی اور مستقبل کے امکانات کو روشن کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ابدیت کو بھی ملحوظ رکھتی ہے۔ یہ وقت کا آئینہ' عادلانہ تلوار اور اس کی مہمیز بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منفعل تاریخ نہیں فعال تاریخ ہے۔ یہ ایک ایسی پیش گوئی ہے جو تاریخ سازی میں ممد ثابت ہوتی ہے عظیم شاعری معاصرین کی روح میں ایسی تخلیقی جوت جگاتی ہے جو موجود سے قوی تر ہوتی ہے اور جو اس کا پردہ چاک کر کے اس میں سے مستقبل کو اخذ کرنے یا اسے مستقبل سے محفوظ رکھنے پر قادر ہے" ----- کیا اقبال کی شاعری نے بالکل یہی نہیں کیا؟

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

(۱) یہ مضمون میں نے اپنی مرتب کردہ کتاب لیکچرز ان اقبال از ڈاکٹر میری این۔ میری شمل (بزبان انگریزی) مطبوعہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۔۔۔۔ سے ترجمہ کیا ہے اس میں جرمن فلسفی پان وچ اور اقبال کی مماثلتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ میں نے پان وچ کے حالات کا خلاصہ بنا لیا ہے البتہ اصل مضمون کا مکمل ترجمہ کیا ہے (مترجم)

(۲) یہاں Measures Before The Mesures پان وچ کے نزدیک وقت زندگی کی دھڑکن ہے۔ اس نے ایک جرمن اصطلاح (ENERGIESTOSSE) کے ذریعے اسے ظاہر کیا ہے جس کے معنی ہیں توانائی کی بوچھاڑ۔ یہ وقفوں میں منقسم ہے اور اسے انسانی جسم میں محسوس بھی کیا جا سکتا ہے اور شمار بھی

"زمان محض ایک لفظ نہیں بلکہ ایک کل ہے جو عدد کی طرح بتدریج جمع ہوتا ہے کیونکہ اس کی وحدت آنے والے یونٹ کی وجہ سے تباہ نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے اس کا انحصار کسی فرد کے اپنے زمانی تجربے پر ہوتا ہے یہ بہرحال معروضی نہیں ہوتا کیونکہ اسکا تعلق فرد کی ذات کی نمو (INDIVIDUATION) سے ہوتا ہے اور اس کا انحصار ان عوامل پر بھی ہوتا ہے جو فرد کے ارتقاء کو ظاہر کرتے ہیں(۲)

کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جس کا لفظی ترجمہ ممکن نہیں دراصل یہ ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جو کسی شے یا مظہر کی کیفیت اور کمیت کی عضوی وحدت کو ظاہر کرتی ہے کیفیتی طور پر منفرد شے اپنے مخصوص کمیتی اوصاف کی حامل ہوتی ہے یہ اوصاف متحرک اور قابل تغیر ہوتے ہیں یہ تبدیلیاں بہرحال ایک ضروری حد کے اندر رہتی ہیں اور اس حد سے ماورا کمیتی تبدیلیوں کیفتی تبدیلیاں پر منتج ہوتی ہیں کیفیت اور کمیت میں اور وحدت کا انحصار کسی شے کی فطری ساخت پر ہوتا ہے سب سے پہلے ہیگل نے اس فلسفیانہ اصطلاح کو استعمال اور رائج کیا۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے "اے ڈکشنری آف فلاسفی ازایم روسن تھال مطلوعہ ماسکو ۱۹۶۷ء

Scanned by CamScanner

ینگ کے نزدیک فردیت (INDIVIDUATION) سے مراد فرد کی عضویاتی اور ذہنی تفاعلات (FUNCTIONS) میں حاصل ہونے والی نمو ہے تفصیل کے لئے دیکھئے "اے ڈکشنری آف سائیکالوجی -- از جیمز ڈریور (مترجم)

۲- غالب نے کہا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

۱- آگہی نیں اک خلا موجود ہے
اس کا مطلب ہے خدا موجود ہے

عدم (مترجم)

۱- PRIESCH کے الفاظ میں ENTELECHIA تمام زندہ نامیات کی وہ اہلیت ہے جس کے تحت وہ ہر دم تغیر پذیر ماحول میں مطابقت اختیار کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنے ضائع شدہ عضلات کو دوبارہ تخلیق بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اصطلاح کسی مقصد کی سمت میں جانے والے کردار کو ظاہر کرتی ہے اور اس نظریے کو فطری علوم سے کافی ٹھوس شواہد ملے ہیں مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے۔

CONTEMPORARY THEROIES AND SYSTEM IN PSICHOLOGY" BY BENJAMIN B.WOLMAN (ص مترجم)

۱- اس کو تصوف کی اصطلاح میں "قوس صعودی" کہا جاتا ہے جس کے تحت ایک صوفی آگے بڑھنے کے لئے ماضی سے قوت حاصل کرتا ہے۔ (مترجم)

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner